QuranUrdu.com

تفہیم القرآن

الصّٰفّٰت

(۳۷)

QuranUrdu.com

الصّافّات

نام پہلی ہی آیت کے لفظ وَالصّٰٓفّٰتِ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول مضامین اور طرزِ کلام سے مُترشّح ہوتا ہے کہ یہ سورت غالباً مکّی دَور کے وسط میں، بلکہ شاید اس دورِ مُتوسّط کے بھی آخری زمانے میں نازل ہوئی ہے۔ اندازِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ پَس منظر میں مخالفت پوری شدت کے ساتھ برپا ہے اور نبی و اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت دل شکن حالات سے سابقہ درپیش ہے۔

موضوع و مضمون اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید و آخرت کا جواب جس تمسخر اور استہزا کے ساتھ دیا جا رہا تھا، اور آپؐ کے دعوائے رسالت کو تسلیم کرنے سے جس شدّت کے ساتھ انکار کیا جا رہا تھا، اُس پر کفارِ مکہ کو نہایت پُرزور طریقے سے تنبیہ کی گئی ہے اور آخر میں انھیں صاف صاف خبردار کر دیا گیا ہے کہ عنقریب یہی پیغمبرؐ، جس کا تم مذاق اُڑا رہے ہو، تمھارے دیکھتے دیکھتے تم پر غالب آ جائے گا، اور تم اللہ کے لشکر کو خود اپنے گھر کے صحن میں اُترا ہوا پاؤ گے۔ (آیات نمبر ۱۷۱ تا ۱۷۹) یہ نوٹس اُس زمانے میں دیا گیا تھا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کے آثار دُور دُور کہیں نظر نہ آتے تھے۔ مسلمان (جن کو ان آیات میں اللہ کا لشکر کہا گیا ہے) بُری طرح ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے تھے۔ ان کی تین چوتھائی تعداد ملک چھوڑ کر نکل گئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بمشکل ۴۰-۵۰ صحابہؓ مکے میں رہ گئے تھے اور انتہائی بے بسی کے ساتھ ہر طرح کی زیادتیاں برداشت کر رہے تھے۔ اِن حالات میں ظاہر اسباب کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص یہ باور نہ کر سکتا تھا کہ غلبہ آخرِ کار محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی مٹھی بھر بے سروسامان جماعت کو نصیب ہوگا۔ بلکہ دیکھنے والے تو یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ تحریک مکے کی گھاٹیوں ہی میں دفن ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن ۱۵-۱۶ سال سے زیادہ مدّت نہ گزری تھی کہ فتحِ مکہ کے موقع پر ٹھیک وہی کچھ پیش آ گیا جس سے کفار کو خبردار کیا گیا تھا۔

تنبیہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں تفہیم اور ترغیب کا حق بھی پورے توازُن کے ساتھ ادا فرمایا ہے۔ توحید اور آخرت کے عقیدے کی صحّت پر مختصر دل نشین دلائل دیے ہیں، مشرکین کے عقائد پر تنقید کر کے بتایا ہے کہ وہ کیسی لَغو باتوں پر ایمان لائے بیٹھے ہیں، اِن گمراہیوں کے بُرے نتائج سے آگاہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ایمان و عملِ صالح کے نتائج کس قدر شان دار ہیں۔ پھر اسی سلسلے میں پچھلی تاریخ کی مثالیں دی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے انبیاؑ کے ساتھ اور ان کی قوموں کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے۔ کس کس طرح اس نے اپنے وفادار بندوں کو نوازا ہے اور کس طرح ان کے جھٹلانے والوں کو سزا دی ہے۔

QuranUrdu.com

جو تاریخی قصّے اس سورہ میں بیان کیے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ سبق آموز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ طیّبہ کا یہ اہم واقعہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک اشارہ پاتے ہی اپنے اِکلوتے بیٹے کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس میں صرف اُن کفارِ قریش ہی کے لیے سبق نہ تھا جو حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اپنے نسبی تعلق پر فخر کرتے پھرتے تھے، بلکہ اُن مسلمانوں کے لیے بھی سبق تھا جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے تھے۔ یہ واقعہ سُنا کر انھیں بتا دیا گیا کہ اسلام کی حقیقت اور اس کی اصلی روح کیا ہے، اور اُسے اپنا دین بنا لینے کے بعد ایک مومنِ صادق کو کس طرح اللہ کی رضا پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔

سورہ کی آخری آیات محض کفار کے لیے تنبیہ ہی نہ تھیں بلکہ اُن اہلِ ایمان کے لیے بشارت بھی تھیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید وحمایت میں انتہائی حوصلہ شکن حالات کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انھیں یہ آیات سُنا کر خوش خبری دے دی گئی کہ آغازِ کار میں جن مصائب سے انھیں سابقہ پیش آ رہا ہے ان پر گھبرائیں نہیں، آخرِ کار غلبہ انھی کو نصیب ہو گا، اور باطل کے وہ عَلَم بردار جو اِس وقت غالب نظر آ رہے ہیں، انھی کے ہاتھوں مغلوب ومفتوح ہو کر رہیں گے۔ چند ہی سال بعد واقعات نے بتا دیا کہ یہ محض خالی تسلّی نہ تھی، بلکہ ایک ہونے والا واقعہ تھا جس کی پیشگی خبر دے کر ان کے دل مضبوط کیے گئے تھے۔

QuranUrdu.com

آیاتہا ۱۸۲ — سُوْرَةُ الصّٰفّٰتِ مَكِّيَّةٌ — رکوعاتہا ۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

المنزل ۶

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ﴿۱﴾ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ﴿۲﴾ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۙ﴿۳﴾
اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ؕ﴿۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ

قطار در قطار صف باندھنے والوں کی قسم! پھر اُن کی قسم جو ڈانٹنے پھٹکارنے والے ہیں، پھر اُن کی قسم جو کلامِ نصیحت سنانے والے ہیں[۱]، تمہارا معبودِ حقیقی بس ایک ہی ہے[۲]____وہ جو زمین اور آسمانوں کا اور

۱ – مفسرین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ ان تینوں گروہوں سے مراد فرشتوں کے گروہ ہیں۔ اور یہی تفسیر حضرات عبداللہؓ بن مسعود، ابنِ عباسؓ، قتادہؒ، مَسروقؒ، سعید بن جُبیرؒ، عِکرِمہؒ، مجاہدؒ، سُدّیؒ، ابنِ زیدؒ اور ربیعؒ بن اَنَس سے منقول ہے۔ بعض مفسرین نے اس کی دوسری تفسیریں بھی کی ہیں، مگر موقع و محل سے یہی تفسیر زیادہ مناسبت رکھتی نظر آتی ہے۔

اس میں ”قطار در قطار صف باندھنے“ کا اشارہ اس طرف ہے کہ تمام فرشتے جو نظامِ کائنات کی تدبیر کر رہے ہیں، اللہ کے بندے اور غلام ہیں، اس کی اطاعت و بندگی میں صف بستہ ہیں اور اس کے فرامین کی تعمیل کے لیے ہر وقت مستعد ہیں۔ اس مضمون کا اِعادہ آگے چل کر پھر آیت ۱۶۵ میں کیا گیا ہے، جس میں فرشتے خود اپنے متعلق کہتے ہیں: وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ۔

”ڈانٹنے اور پھٹکارنے“ سے مراد بعض مفسرین کی رائے میں یہ ہے کہ کچھ فرشتے ہیں جو بادلوں کو ہانکتے اور بارش کا انتظام کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ مفہوم بھی غلط نہیں ہے، لیکن آگے کے مضمون سے جو مفہوم زیادہ مناسبت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ انھی فرشتوں میں سے ایک گروہ وہ بھی ہے جو نافرمانوں اور مجرموں کو پھٹکارتا ہے اور اس کی یہ پھٹکار صرف لفظی ہی نہیں ہوتی بلکہ انسانوں پر وہ حوادثِ طبیعی اور آفاتِ تاریخی کی شکل میں برستی ہے۔

”کلامِ نصیحت سنانے“ سے مراد یہ ہے کہ انھی فرشتوں میں وہ بھی ہیں جو امرِحق کی طرف توجہ دلانے کے لیے تذکیر کی خدمت انجام دیتے ہیں، حوادثِ زمانہ کی شکل میں بھی جن سے عبرت حاصل کرنے والے عبرت حاصل کرتے ہیں، اور اُن تعلیمات کی صورت میں بھی جو اُن کے ذریعے سے انبیاؑ پر نازل ہوتی ہیں، اور ان اُلہامات کی صورت میں بھی جو اُن کے واسطے سے نیک انسانوں پر ہوتے ہیں۔

۲ – یہ وہ حقیقت ہے جس پر مذکورہ صفات کے حامل فرشتوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ گویا دوسرے الفاظ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ پورا نظامِ کائنات جو اللہ کی بندگی میں چل رہا ہے، اور اس کائنات کے وہ سارے مظاہر جو اللہ کی بندگی سے انحراف کرنے کے بُرے نتائج انسانوں کے سامنے لاتے ہیں، اور اس کائنات کے اندر یہ انتظام کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک پے در پے ایک ہی حقیقت کی یاد دہانی مختلف طریقوں سے کرائی جا رہی ہے، یہ سب چیزیں اس بات پر گواہ ہیں کہ انسانوں کا ”اِلٰہ“ صرف

QuranUrdu.com

مَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۝٥ إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا
بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ ۝٦ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ ۝٧

تمام اُن چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں، اور سارے مشرقوں[۳] کا مالک۔[۴]

ہم نے آسمانِ دُنیا[۵] کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے اور ہر شیطانِ سرکش سے اس کو محفوظ کر دیا ہے۔[۶]

ایک ہی ہے۔

''الٰہ'' کے لفظ کا اِطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے: ایک، وہ معبود جس کی بالفعل بندگی و عبادت کی جا رہی ہو۔ دوسرے، وہ معبود جو فی الحقیقت اِس کا مستحق ہو کہ اُس کی بندگی و عبادت کی جائے۔ یہاں الٰہ کا لفظ دوسرے معنٰی میں استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ پہلے معنٰی میں تو انسانوں نے دوسرے بہت سے الٰہ بنا رکھے ہیں۔ اسی بنا پر ہم نے ''الٰہ'' کا ترجمہ ''معبُودِ حقیقی'' کیا ہے۔

۳- سورج ہمیشہ ایک ہی مَطلَع سے نہیں نکلتا بلکہ ہر روز ایک نئے زاویے سے طُلوع ہوتا ہے۔ نیز ساری زمین پر وہ بیک وقت طالع نہیں ہو جاتا بلکہ زمین کے مختلف حصوں پر مختلف اوقات میں اس کا طُلوع ہوا کرتا ہے۔ ان وجوہ سے مشرق کے بجائے مشارق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ مغارب کا ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ مشارق کا لفظ خود ہی مغارب پر دلالت کرتا ہے۔ تاہم ایک جگہ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ (المعارج: ۴۰)

۴- ان آیات میں جو حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کا مالک و فرماں روا ہی انسانوں کا اصل معبود ہے، اور وہی درحقیقت معبُود ہو سکتا ہے، اور اسی کو معبُود ہونا چاہیے۔ یہ بات سراسر عقل کے خلاف ہے کہ رب (یعنی مالک اور حاکم اور مُربّی و پروردگار) کوئی ہو اور الٰہ (عبادت کا مستحق) کوئی اَور ہو جائے۔ عبادت کی بنیادی وجہ ہی یہ ہے کہ آدمی کا نفع و ضرر، اس کی حاجتوں اور ضرورتوں کا پورا ہونا، اس کی قسمت کا بننا اور بگڑنا، بلکہ بجائے خود اس کا وجود و بقا ہی جس کے اختیار میں ہے، اُس کی بالاتری تسلیم کرنا اور اس کے آگے جھکنا آدمی کی فطرت کا عین تقاضا ہے۔ اس وجہ کو آدمی سمجھ لے تو خود بخود اس کی سمجھ میں یہ بات آ جاتی ہے کہ اختیارات والے کی عبادت نہ کرنا اور بے اختیار کی عبادت کرنا، دونوں صریح خلافِ عقل و فطرت ہیں۔ عبادت کا استحقاق پہنچتا ہی اس کو ہے جو اقتدار رکھتا ہے۔ رہیں بے اقتدار ہستیاں، تو وہ نہ اِس کی مستحق ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے، اور نہ ان کی عبادت کرنے اور ان سے دعائیں مانگنے کا کچھ حاصل ہے، کیونکہ ہماری کسی درخواست پر کوئی کارروائی کرنا سرے سے ان کے اختیار میں ہے ہی نہیں۔ ان کے آگے عاجزی و نیازمندی کے ساتھ جھکنا اور ان سے دعا مانگنا بالکل ویسا ہی احمقانہ فعل ہے جیسے کوئی شخص کسی حاکم کے سامنے جائے اور اس کے حضور درخواست پیش کرنے کے بجائے جو دوسرے سائلین وہاں درخواستیں لیے کھڑے ہوں انھی میں سے کسی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جائے۔

۵- آسمانِ دنیا سے مراد قریب کا آسمان ہے، جس کا مشاہدہ کسی دُوربین کی مدد کے بغیر ہم برہنہ آنکھ سے کرتے ہیں۔ اس کے آگے جو عالَم مختلف طاقتوں کی دوربینوں سے نظر آتے ہیں، اور جن عالَموں تک ابھی ہمارے وسائلِ مشاہدہ کی رسائی

QuranUrdu.com

لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝٨ دُحُوْرًا
وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝٩ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ
ثَاقِبٌ ۝١٠ فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ

یہ شیاطین مَلاءِ اعلیٰ کی باتیں نہیں سُن سکتے، ہر طرف سے مارے اور ہانکے جاتے ہیں اور ان کے لیے پیہم عذاب ہے۔ تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اُڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔[۷] اب اِن سے پُوچھو، ان کی پیدایش زیادہ مشکل ہے یا اُن چیزوں کی جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں؟[۸]

نہیں ہوئی ہے، وہ سب دُور کے آسمان ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ "سماء" کسی متعیّن چیز کا نام نہیں ہے بلکہ قدیم ترین زمانے سے آج تک انسان بالعُموم یہ لفظ اور اُس کے ہم معنی الفاظ عالَمِ بالا کے لیے استعمال کرتا چلا آ رہا ہے۔

۶ – یعنی عالَمِ بالا محض خلا ہی نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اس میں نفوذ کر جائے، بلکہ اس کی بندش ایسی مضبوط ہے، اور اس کے مختلف خِطّے ایسی مستحکم سرحدوں سے محصور کیے گئے ہیں کہ کسی شیطانِ سرکش کا ان حدوں سے گزر جانا ممکن نہیں ہے۔ کائنات کے ہر تارے اور ہر سیّارے کا اپنا ایک دائرہ اور کُرَہ (Sphere) ہے جس کے اندر سے کسی کا نکلنا بھی سخت دشوار ہے اور جس میں باہر سے کسی کا داخل ہونا بھی آسان نہیں ہے۔ ظاہری آنکھ سے کوئی دیکھے تو خلائے محض کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن حقیقت میں اس خلا کے اندر بے حد و حساب خِطّے ایسی مضبوط سرحدوں سے محفوظ کیے گئے ہیں جن کے مقابلے میں آہنی دیواروں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ان گُونا گوں مشکلات سے کیا جا سکتا ہے جو زمین کے رہنے والے انسان کو اپنے قریب ترین ہمسایے، چاند تک پہنچنے میں پیش آ رہی ہیں۔ ایسی ہی مشکلات زمین کی دوسری مخلوق، یعنی جِنّوں کے لیے بھی عالَمِ بالا کی طرف صُعُود کرنے میں مانع ہیں۔

۷ – اس مضمون کو سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اُس وقت عرب میں کہانت کا بڑا چرچا تھا۔ جگہ جگہ کاہن بیٹھے پیشین گوئیاں کر رہے تھے، غیب کی خبریں دے رہے تھے، گم شدہ چیزوں کے پتے بتا رہے تھے، اور لوگ اپنے اگلے پچھلے حال دریافت کرنے کے لیے ان کی طرف رُجوع کر رہے تھے۔ ان کاہنوں کا دعویٰ یہ تھا کہ جِنّ اور شیاطین ان کے قبضے میں ہیں اور وہ انھیں ہر طرح کی خبریں لا لا کر دیتے ہیں۔ اس ماحول میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے اور آپؐ نے قرآنِ مجید کی آیات سنانی شروع کیں جن میں پچھلی تاریخ اور آیندہ پیش آنے والے حالات کی خبریں دی گئی تھیں، اور ساتھ ساتھ آپؐ نے یہ بھی بتایا کہ ایک فرشتہ یہ آیات میرے پاس لاتا ہے، تو آپؐ کے مخالفین نے فوراً آپؐ کے اُوپر کاہن کی پھبتی کَس دی اور لوگوں سے کہنا شروع کر دیا کہ اِن کا تعلّق بھی دوسرے کاہنوں کی طرح کسی شیطان سے ہے جو عالَمِ بالا سے کچھ سُن گُن لے کر اِن کے پاس آ جاتا ہے اور یہ اُسے وحیِ الٰہی بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ اس الزام کے جواب میں اللہ تعالیٰ یہ حقیقت ارشاد فرما رہا ہے کہ شیاطین کی تو رسائی ہی

QuranUrdu.com

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَاِذَا
ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

اِن کو تو ہم نے لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے[۹]۔ تم (اللہ کی قدرت کے کرشموں پر) حیران ہو اور یہ اس کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ سمجھایا جاتا ہے تو سمجھ کر نہیں دیتے۔ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اسے ٹھٹھوں میں اڑاتے ہیں

عالَم بالا تک نہیں ہو سکتی۔ وہ اِس پر قادر نہیں ہیں کہ ملاءِ اعلیٰ (یعنی گروہِ ملائکہ) کی باتیں سُن سکیں اور لا کر کسی کو خبریں دے سکیں۔ اور اگر اتفاقاً کوئی ذرا سی بِھنک کسی شیطان کے کان میں پڑ جاتی ہے تو قبل اس کے کہ وہ اُسے لے کر نیچے آئے، ایک تیز شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ملائکہ کے ذریعے سے کائنات کا جو عظیم الشان نظام چل رہا ہے وہ شیاطین کی دراندازی سے پوری طرح محفوظ ہے۔ اُس میں دخل دینا تو درکنار، اس کی معلومات حاصل کرنا بھی ان کے بس میں نہیں ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الحجر، حواشی ۸ تا ۱۲)

۸ - یہ کفارِ مکہ کے اُس شبہ کا جواب ہے جو وہ آخرت کے بارے میں پیش کرتے تھے۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ آخرت ممکن نہیں ہے، کیونکہ مرے ہوئے انسانوں کا دوبارہ پیدا ہونا محال ہے۔ اس کے جواب میں امکانِ آخرت کے دلائل پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سب سے پہلے اُن کے سامنے یہ سوال رکھتا ہے کہ اگر تمھارے نزدیک مرے ہوئے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا بڑا سخت کام ہے جس کی قدرت تمھارے خیال میں ہم کو حاصل نہیں ہے تو بتاؤ کہ یہ زمین و آسمان، اور یہ بے شمار اشیا جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، ان کا پیدا کرنا کوئی آسان کام ہے؟ آخر تمھاری عقل کہاں ماری گئی ہے کہ جس خدا کے لیے یہ عظیم کائنات پیدا کرنا مشکل نہ تھا، اور جو خود تم کو ایک دفعہ پیدا کر چکا ہے، اس کے متعلق تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھاری دوبارہ تخلیق سے وہ عاجز ہے۔

۹ - یعنی یہ انسان کوئی بڑی چیز تو نہیں ہے۔ مٹی سے بنایا گیا ہے اور پھر اسی مٹی سے بنایا جا سکتا ہے۔

لیس دار گارے سے انسان کی پیدایش کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسانِ اوّل کی پیدایش مٹی سے ہوئی تھی اور پھر آگے نسلِ انسانی اُسی پہلے انسان کے نطفے سے وجود میں آئی۔ اور یہ بھی ہے کہ ہر انسان لیس دار گارے سے بنا ہے۔ اس لیے کہ انسان کا سارا مادّۂ وجود زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ جس نطفے سے وہ پیدا ہوا ہے وہ غذا سے بنتا ہے، اور استقرارِ حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی پوری ہستی جن اجزا سے مُرکّب ہوتی ہے وہ سب بھی غذا ہی سے فراہم ہوتے ہیں۔ یہ غذا خواہ حیوانی ہو یا نباتی، آخرِ کار اس کا ماخذ وہ مٹی ہے جو پانی کے ساتھ مل کر اس قابل ہوتی ہے کہ انسان کی خوراک کے لیے غلّے اور ترکاریاں اور پھل نکالے، اور اُن حیوانات کو پرورش کرے جن کا دودھ اور گوشت انسان کھاتا ہے۔

پس بِنائے اِستدلال یہ ہے کہ یہ مٹی اگر حیات قُبول کرنے کے لائق نہ تھی تو تم آج کیسے زندہ موجود ہو؟ اور اگر اس میں زندگی پیدا کیے جانے کا آج امکان ہے، جیسا کہ تمھارا موجود ہونا خود اس کے امکان کو صریح طور پر ثابت کر رہا ہے، تو کل دوبارہ اسی مٹی سے تمھاری پیدایش کیوں ممکن نہ ہوگی؟

QuranUrdu.com

وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۚۖ ﴿۱۵﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا
وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۙ ﴿۱۶﴾ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ ﴿۱۷﴾ قُلْ نَعَمْ
وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ۚ ﴿۱۸﴾ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ
يَنْظُرُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۲۰﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ
الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۧ ﴿۲۱﴾ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ ع ۴۱ ۵

اور کہتے ہیں: "یہ تو صریح جادو ہے[10]، بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں اُس وقت ہم پھر زندہ کر کے اُٹھا کھڑے کیے جائیں؟ اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آبا و اجداد بھی اُٹھائے جائیں گے؟" ان سے کہو: ہاں، اور تم (خدا کے مقابلے میں) بے بس ہو[11]۔

بس ایک ہی جِھڑکی ہوگی اور یکایک یہ اپنی آنکھوں سے (وہ سب کچھ جس کی خبر دی جا رہی ہے) دیکھ رہے ہوں[12] گے۔ اُس وقت یہ کہیں گے: ہائے ہماری کم بختی، یہ تو یوم الجزا ہے ـــــ "یہ وہی فیصلے کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے[13]۔" ع (حکم ہوگا:) گھیر لاؤ سب ظالموں[14] اور ان کے ساتھیوں[15]

---

۱۰ - یعنی عالَمِ طلسمات کی باتیں ہیں۔ کوئی جادو کی دنیا ہے جس کا یہ شخص ذکر کر رہا ہے، جس میں مُردے اٹھیں گے، عدالت ہوگی، جنت بسائی جائے گی اور دوزخ کے عذاب ہوں گے۔ یا پھر یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ شخص دل چلوں کی سی باتیں کر رہا ہے، اس کی یہ باتیں ہی اس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے جس کی وجہ سے بھلا چنگا آدمی یہ باتیں کرنے لگا۔

۱۱ - یعنی اللہ جو کچھ بھی تمھیں بنانا چاہے بنا سکتا ہے۔ جب اس نے چاہا اُس کے ایک اشارے پر تم وجود میں آ گئے۔ جب وہ چاہے گا اس کے ایک اشارے پر تم مر جاؤ گے۔ اور پھر جس وقت بھی وہ چاہے گا اس کا ایک اشارہ تمھیں اُٹھا کھڑا کرے گا۔

۱۲ - یعنی جب یہ بات ہونے کا وقت آئے گا تو دنیا کو دوبارہ برپا کر دینا کوئی بڑا لمبا چوڑا کام نہ ہوگا۔ بس ایک ہی جِھڑکی سوتوں کو جگا اُٹھانے کے لیے کافی ہوگی۔ "جھڑکی" کا لفظ یہاں بہت معنی خیز ہے۔ اس سے بَعث بعد الموت کا کچھ ایسا نقشہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جو انسان مرے تھے وہ گویا سوتے پڑے ہیں، یکایک کوئی ڈانٹ کر کہتا ہے: "اُٹھ جاؤ" اور بس آن کی آن میں وہ سب اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

QuranUrdu.com

وَ مَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۲۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ
الْجَحِيْمِ ﴿۲۳﴾ وَ قِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴿۲۴﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿۲۵﴾
بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ

اور اُن معبُودوں کو جن کی وہ خدا کو چھوڑ کر بندگی کیا کرتے تھے[16]، پھر ان سب کو جہنّم کا راستہ دکھاؤ۔ اور ذرا اِنھیں ٹھیراؤ، اِن سے کچھ پوچھنا ہے۔" کیا ہو گیا تمھیں، اب کیوں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے؟ ارے، آج تو یہ اپنے آپ کو (اور ایک دوسرے کو) حوالے کیے دے رہے ہیں[17]!" اس کے بعد یہ ایک دوسرے کی طرف

---

۱۳ - ہوسکتا ہے کہ یہ بات اُن سے اہلِ ایمان کہیں، ہوسکتا ہے کہ یہ فرشتوں کا قول ہو، ہوسکتا ہے کہ میدانِ حشر کا سارا ماحول اُس وقت زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ خود انھی لوگوں کا دوسرا ردِّعمل ہو۔ یعنی اپنے دلوں میں وہ اپنے آپ ہی کو مخاطَب کر کے کہیں کہ دنیا میں ساری عمر تم یہ سمجھتے رہے کہ کوئی فیصلے کا دن نہیں آنا ہے، اب آ گئی تمھاری شامت، جس دن کو جھٹلاتے تھے وہی سامنے آ گیا۔

۱۴ - ظالم سے مراد صرف وہی لوگ نہیں ہیں جنھوں نے دوسروں پر ظلم کیا ہو، بلکہ قرآن کی اِصطِلاح میں ہر وہ شخص ظالم ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بغاوت و سرکشی اور نافرمانی کی راہ اختیار کی ہو۔

۱۵ - اصل میں لفظ "اَزْوَاجٌ" استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد ان کی وہ بیویاں بھی ہوسکتی ہیں جو اس بغاوت میں ان کی رفیق تھیں، اور وہ سب لوگ بھی ہوسکتے ہیں جو انھی کی طرح باغی و سرکش اور نافرمان تھے۔ علاوہ بریں اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ایک ایک قسم کے مجرم الگ الگ جتّھوں کی شکل میں جمع کیے جائیں گے۔

۱۶ - اس جگہ معبُودوں سے مراد دو قسم کے معبُود ہیں: ایک، وہ انسان اور شیاطین جن کی اپنی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ لوگ خدا کو چھوڑ کر اُن کی بندگی کریں۔ دوسرے، وہ اصنام اور شجر و حَجَر وغیرہ جن کی پرستش دنیا میں کی جاتی رہی ہے۔ ان میں سے پہلی قسم کے معبُود تو خود مجرمین میں شامل ہوں گے اور انھیں سزا کے طور پر جہنم کا راستہ دکھایا جائے گا۔ اور دوسری قسم کے معبُود اپنے پرستاروں کے ساتھ اس لیے جہنّم میں ڈالے جائیں گے کہ وہ انھیں دیکھ کر ہر وقت شرمندگی محسوس کریں اور اپنی حماقتوں کا ماتم کرتے رہیں۔ ان کے علاوہ ایک تیسری قسم کے معبود وہ بھی ہیں جنھیں دنیا میں پُوجا تو گیا ہے، مگر خود ان کا اپنا اِیما ہرگز یہ نہ تھا کہ ان کی پرستش کی جائے، بلکہ اس کے برعکس وہ ہمیشہ انسانوں کو غیر اللہ کی پرستش سے منع کرتے رہے، مثلاً فرشتے، انبیا اور اولیا۔ اس قسم کے معبود ظاہر ہے کہ اُن معبُودوں میں شامل نہ ہوں گے جنھیں اپنے پرستاروں کے ساتھ جہنم کی طرف دھکیلا جائے گا۔

۱۷ - پہلا فقرہ مجرمین کو خطاب کر کے ارشاد ہوگا۔ اور دوسرا فقرہ اُن عام حاضرین کی طرف رُخ کر کے فرمایا جائے گا جو اُس وقت جہنّم کی طرف مجرمین کی روانگی کا منظر دیکھ رہے ہوں گے۔ یہ فقرہ خود بتا رہا ہے کہ اُس وقت حالت کیا ہو گی۔

QuranUrdu.com

يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿۲۸﴾
قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۹﴾ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ
مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ
رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿۳۲﴾

مُڑیں گے اور باہم تکرار شروع کر دیں گے۔ (پیروی کرنے والے اپنے پیشواؤں سے) کہیں گے: "تم ہمارے پاس سیدھے رُخ سے آتے تھے۔"[18] وہ جواب دیں گے: "نہیں، بلکہ تم خود ایمان لانے والے نہ تھے۔ ہمارا تم پر کوئی زور نہ تھا، تم خود ہی سرکش لوگ تھے۔ آخر کار ہم اپنے رب کے اِس فرمان کے مستحق ہو گئے کہ ہم عذاب کا مزا چکھنے والے ہیں۔ سو ہم نے تم کو بہکایا، ہم خود بہکے ہوئے تھے۔"[19]

بڑے بڑے ہیکڑ مجرمین کے کَس بَل نکلے چکے ہوں گے اور کسی مُزاحمت کے بغیر وہ کان دبائے جہنّم کی طرف جا رہے ہوں گے۔ کہیں کوئی ہز میجسٹی دھکے کھا رہے ہوں گے اور درباریوں میں سے کوئی "اعلیٰ حضرت" کو بچانے کے لیے آگے نہ بڑھے گا۔ کہیں کوئی فاتحِ عالَم اور کوئی ڈکٹیٹر انتہائی ذلّت کے ساتھ چلا جا رہا ہو گا اور اس کا لشکرِ جرّار خود اسے سزا کے لیے پیش کر دے گا۔ کہیں کوئی پیر صاحب یا گُرو جی یا ہولی فادر واصل بجہنم ہو رہے ہوں گے اور مریدوں میں سے کسی کو یہ فکر نہ ہو گی کہ حضرتِ والا کی توہین نہ ہونے پائے۔ کہیں کوئی لیڈر صاحب کَس مپُرسی کے عالَم میں جہنّم کی طرف رواں دواں ہوں گے اور دنیا میں جو لوگ ان کی کبریائی کے جھنڈے اُٹھائے پھرتے تھے وہ سب وہاں اُن کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں گے۔ حد یہ ہے کہ جو عاشق دنیا میں اپنے معشوق پر جان چھڑکتے تھے انھیں بھی اس کے حالِ بد کی کوئی پروا نہ ہو گی۔ اس حالت کا نقشہ کھینچ کر اللہ تعالیٰ دراصل یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ دنیا میں انسان اور انسان کے جو تعلقات اپنے رب سے بغاوت پر مبنی ہیں، وہ کس طرح آخرت میں ٹوٹ کر رہ جائیں گے، اور یہاں جو لوگ ہَمچو ما دِیگرے نیست کے غُرور میں مبتلا ہیں، وہاں ان کا تکبُّر کس طرح خاک میں مل جائے گا۔

۱۸ - اصل الفاظ ہیں: كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ "تم ہمارے پاس یمین کی راہ سے آتے تھے۔" یمین کا لفظ عَرَبی زبان میں متعدِّد مفہُومات کے لیے بولا جاتا ہے۔ اگر اس کو قوت و طاقت کے معنیٰ میں لیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ ہم کمزور تھے اور تم ہم پر غالب تھے، اس لیے تم اپنے زور سے ہم کو گمراہی کی طرف کھینچ لے گئے۔ اگر اس کو خیر اور بھلائی کے معنیٰ میں لیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ تم نے خیر خواہ بن کر ہمیں دھوکا دیا۔ تم ہمیں یقین دلاتے رہے کہ جس راہ پر تم ہمیں چلا رہے ہو یہی حق اور بھلائی کی راہ ہے۔ اس لیے ہم تمھارے فریب میں آ گئے۔ اور اگر اسے قَسم کے معنیٰ میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم نے قسمیں کھا کھا کر ہمیں اطمینان دلایا تھا کہ حق وہی ہے جو تم پیش کر رہے ہو۔

QuranUrdu.com

فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ
بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ
يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ
مَّجْنُوْنٍ ﴿۳۶﴾ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّكُمْ
لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ ﴿۳۸﴾ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۹﴾
اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۴۱﴾

اِس طرح وہ سب اُس روز عذاب میں مشترک ہوں گے۔[۲۰] ہم مجرموں کے ساتھ یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا: "اللہ کے سوا کوئی معبُودِ برحق نہیں ہے" تو یہ گھمنڈ میں آجاتے تھے اور کہتے تھے: "کیا ہم ایک شاعرِ مجنون کی خاطر اپنے معبُودوں کو چھوڑ دیں؟" حالانکہ وہ حق لے کر آیا تھا اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی تھی۔[۲۱] (اب ان سے کہا جائے گا کہ) تم لازماً دردناک سزا کا مزا چکھنے والے ہو۔ اور تمھیں جو بدلہ بھی دیا جا رہا ہے انھی اعمال کا دیا جا رہا ہے جو تم کرتے رہے ہو۔ مگر اللہ کے چیدہ بندے (اس انجامِ بد سے) محفوظ ہوں گے۔ ان کے لیے جانا بوجھا رزق ہے،[۲۲]

۱۹- تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد چہارُم، سورۂ سبا، حواشی ۵۱-۵۲-۵۳۔

۲۰- یعنی پیرو بھی اور پیشوا بھی، گمراہ کرنے والے بھی اور گمراہ ہونے والے بھی، ایک ہی عذاب میں شریک ہوں گے۔ نہ پیروؤں کا یہ عذر مسموع ہوگا کہ وہ خود گمراہ نہیں ہوئے تھے بلکہ انھیں گمراہ کیا گیا تھا۔ اور نہ پیشواؤں کی اِس معذرت کو قبُول کیا جائے گا کہ گمراہ ہونے والے خود ہی راہِ راست کے طالب نہ تھے۔

۲۱- رسولوں کی تصدیق کے تین معنٰی ہیں اور تینوں ہی یہاں مراد بھی ہیں۔ ایک، یہ کہ اُس نے کسی سابق رسول کی مخالفت نہ کی تھی کہ اُس رسول کے ماننے والوں کے لیے اُس کے خلاف تعصُّب کی کوئی معقول وجہ ہوتی، بلکہ وہ خدا کے تمام پچھلے رسولوں کی تصدیق کرتا تھا۔ دوسرے، یہ کہ وہ کوئی نئی اور نرالی بات نہیں لایا تھا بلکہ وہی بات پیش کرتا تھا جو ابتدا سے خدا کے تمام رسول پیش کرتے چلے آ رہے تھے۔ تیسرے، یہ کہ وہ اُن تمام خبروں کا صحیح مِصداق تھا جو پچھلے رسولوں نے اُس کے بارے میں دی تھیں۔

۲۲- یعنی ایسا رزق جس کی تمام خوبیاں بتائی جا چکی ہیں، جس کے ملنے کا انھیں یقین ہے، جس کے متعلق انھیں یہ بھی

QuranUrdu.com

فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ۝۴۲ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝۴۳ عَلٰى سُرُرٍ
مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝۴۴ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۝۴۵ بَيْضَآءَ

ہر طرح کی لذیذ چیزیں[۲۳]۔ اور نعمت بھری جنتیں جن میں وہ عزت کے ساتھ رکھے جائیں گے۔ تختوں پر آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ شراب[۲۴] کے چشموں[۲۵] سے ساغر بھر بھر کر ان کے درمیان پھرائے جائیں[۲۶] گے۔ چمکتی ہوئی شراب،

اطمینان ہے کہ وہ ہمیشہ ملتا رہے گا، جس کے بارے میں یہ خطرہ لگا ہوا نہیں ہے کہ کیا خبر، ملے یا نہ ملے۔

۲۳- اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ جنت میں کھانا غذا کے طور پر نہیں بلکہ لذت کے لیے ہوگا۔ یعنی وہاں کھانا اِس غرض کے لیے نہ ہوگا کہ جسم کے تحلیل شدہ اجزا کی جگہ دوسرے اجزا غذا کے ذریعے سے فراہم کیے جائیں، کیونکہ اُس اَبدی زندگی میں سرے سے اجزائے جسم تحلیل ہی نہ ہوں گے، نہ آدمی کو بھوک لگے گی جو اس دنیا میں تحلیل کے عمل کی وجہ سے لگتی ہے، اور نہ جسم اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے غذا مانگے گا۔ اسی بنا پر جنت کے ان کھانوں کے لیے ''فواکہ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے مفہوم میں تَغْذِیَہ کے بجائے تَلَذُّذ کا پہلو نمایاں ہے۔

۲۴- اصل میں یہاں شراب کی تصریح نہیں ہے، بلکہ صرف کأس (ساغر) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن عَرَبی زبان میں کاس کا لفظ بول کر ہمیشہ شراب ہی مراد لی جاتی ہے۔ جس پیالے میں شراب کے بجائے دودھ یا پانی ہو، یا جس پیالے میں کچھ نہ ہو، اسے کأس نہیں کہتے۔ کأس کا لفظ صرف اسی وقت بولا جاتا ہے جب اس میں شراب ہو۔

۲۵- یعنی وہ شراب اُس قسم کی نہ ہوگی جو دنیا میں پھلوں اور غلّوں کو سڑا کر کشید کی جاتی ہے۔ بلکہ وہ قُدرَتی طور پر چشموں سے نکلے گی اور نہروں کی شکل میں بہے گی۔ سورۂ محمد میں اسی مضمون کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے: وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ۔ ''اور شراب کی نہریں جو پینے والوں کے لیے لذت ہوں گی۔''

۲۶- یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ شراب کے یہ ساغر لے کر جنتیوں کے درمیان گردش کون کرے گا۔ اس کی تفصیل دوسرے مقامات پر ارشاد ہوئی ہے: وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ''اور ان کی خدمت کے لیے گردش کریں گے اُن کے خادم لڑکے، ایسے خوبصورت جیسے صدف میں چُھپے ہوئے موتی۔'' (الطّور، آیت ۲۴) وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ''اور ان کی خدمت کے لیے گردش کریں گے ایسے لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہنے والے ہیں۔ تم انھیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی بکھیر دیے گئے ہیں۔'' (الدہر، آیت ۱۹) پھر اس کی مزید تفصیل حضرت اَنَسؓ اور حضرت سَمُرَہؓ بن جُنْدُب کی اُن رِوایات میں ملتی ہے جو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہیں۔ اُن میں بتایا گیا ہے کہ ''مشرکین کے بچے اہلِ جنت کے خادم ہوں گے۔'' (ابوداؤد طَیالِسی، طَبَرانی، بَزّار) یہ رِوایات اگرچہ سنداً ضعیف ہیں، لیکن متعدِّد دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بچے سِنِّ رُشد کو نہیں پہنچے ہیں وہ جنت میں جائیں گے۔ پھر یہ بھی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن بچوں کے والدین جنتی ہوں گے وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہیں گے، تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

QuranUrdu.com

لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۴۶﴾ لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴿۴۷﴾
وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ﴿۴۸﴾ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۴۹﴾
فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۵۰﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ

جو پینے والوں کے لیے لذّت ہوگی۔ نہ ان کے جسم کو اس سے کوئی ضَرَر ہوگا اور نہ ان کی عقل اس سے خراب ہوگی۔[۲۷] اور ان کے پاس نگاہیں بچانے والی[۲۸]، خوبصورت آنکھوں والی عورتیں ہوں گی[۲۹]، ایسی نازک جیسے انڈے کے چھلکے کے نیچے چھُپی ہوئی جِھلّی۔[۳۰]

پھر وہ ایک دوسرے کی طرف متوجّہ ہو کر حالات پوچھیں گے۔ ان میں سے ایک کہے گا:

اس کے بعد لامحالہ وہ بچے رہ جاتے ہیں جن کے ماں باپ جنّتی نہ ہوں گے۔ سو اُن کے متعلق یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے کہ وہ اہلِ جنت کے خادم بنا دیے جائیں۔ (اس کے متعلق تفصیلی بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: فتح الباری اور عُمدۃ القاری، کتاب الجنائز، باب ما قیل فی اولاد المشرکین۔ رسائل و مسائل، جلد سوم، ص ۱۷۷ تا ۱۸۷)

۲۷- یعنی وہ شراب اُن دونوں قسم کی خرابیوں سے خالی ہوگی جو دنیا کی شراب میں ہوتی ہیں۔ دنیا کی شراب میں ایک قسم کی خرابی یہ ہوتی ہے کہ آدمی کے قریب آتے ہی پہلے تو اس کی بدبُو اور سڑاند ناک میں پہنچتی ہے۔ پھر اس کا مزا آدمی کے ذائقے کو تلخ کرتا ہے۔ پھر حلق سے اُترتے ہی وہ پیٹ پکڑ لیتی ہے۔ پھر وہ دماغ کو چڑھتی ہے اور دَورانِ سر لاحق ہوتا ہے۔ پھر وہ جگر کو مُتأثّر کرتی ہے اور آدمی کی صحّت پر اس کے بُرے اثرات مُترتّب ہوتے ہیں۔ پھر جب اس کا نشہ اترتا ہے تو آدمی خُمار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ سب جسمانی ضرر ہیں۔ دوسری قسم کی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اسے پی کر آدمی بہکتا ہے، اَول فَول بکتا ہے اور عَرْبدہ کرتا ہے۔ یہ شراب کے عقلی نقصانات ہیں۔ دنیا میں انسان صرف سُرور کی خاطر شراب کے یہ سارے نقصانات برداشت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنت کی شراب میں سُرور تو پوری طرح ہوگا (لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ)، لیکن ان دونوں قسم کی خرابیوں میں سے کوئی خرابی بھی اس میں نہ ہوگی۔

۲۸- یعنی اپنے شوہر کے سوا کسی اور کی طرف نگاہ نہ کرنے والی۔

۲۹- بعید نہیں ہے کہ یہ وہ لڑکیاں ہوں جو دنیا میں سِنِّ رُشد کو پہنچنے سے پہلے مر گئی ہوں اور جن کے والدین جنت میں جانے کے مستحق نہ ہوئے ہوں۔ یہ بات اس قیاس کی بنا پر کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح ایسے لڑکے اہلِ جنت کی خدمت کے لیے مقرر کر دیے جائیں گے اور وہ ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، اسی طرح ایسی لڑکیاں بھی اہلِ جنت کے لیے حوریں بنا دی جائیں گی اور وہ ہمیشہ نَوخیز لڑکیاں ہی رہیں گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۳۰- اصل الفاظ ہیں كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ "گویا وہ چھُپے ہوئے یا محفوظ رکھے ہوئے انڈے ہیں۔" ان الفاظ

QuranUrdu.com

اِنِّیۡ كَانَ لِیۡ قَرِیۡنٌ ﴿۵۱﴾ یَّقُوۡلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الۡمُصَدِّقِیۡنَ ﴿۵۲﴾ ءَاِذَا
مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِیۡنُوۡنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ هَلۡ اَنۡتُمۡ
مُّطَّلِعُوۡنَ ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیۡ سَوَآءِ الۡجَحِیۡمِ ﴿۵۵﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنۡ
كِدۡتَّ لَتُرۡدِیۡنِ ﴿۵۶﴾ وَلَوۡلَا نِعۡمَةُ رَبِّیۡ لَكُنۡتُ مِنَ الۡمُحۡضَرِیۡنَ ﴿۵۷﴾
اَفَمَا نَحۡنُ بِمَیِّتِیۡنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّا مَوۡتَتَنَا الۡاُوۡلٰی وَمَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِیۡنَ ﴿۵۹﴾

”دنیا میں میرا ایک ہم نشین تھا جو مجھ سے کہا کرتا تھا: کیا تم بھی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو[۳۱]؟ کیا واقعی جب ہم مر چکے ہوں گے اور مٹّی ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جائیں گے تو ہمیں جزا و سزا دی جائے گی؟ اب کیا آپ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ صاحب اب کہاں ہیں؟“ یہ کہہ کر جونہی وہ جُھکے گا تو جہنم کی گہرائی میں اس کو دیکھ لے گا اور اس سے خطاب کر کے کہے گا: ”خدا کی قسم! تُو تو مجھے تباہ ہی کر دینے والا تھا۔ میرے رب کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو آج میں بھی اُن لوگوں میں سے ہوتا جو پکڑے ہوئے آئے ہیں[۳۲]۔ اچھا، تو کیا اب ہم مرنے والے نہیں ہیں؟ موت جو ہمیں آنی تھی، وہ بس پہلے آ چکی؟ اب ہمیں کوئی عذاب نہیں ہونا[۳۳]؟“

کی مختلف تعبیرات اہلِ تفسیر نے بیان کی ہیں۔ مگر صحیح تفسیر وہی ہے جو حضرت اُمِّ سَلَمہ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے اس آیت کا مطلب حضورؐ سے پوچھا تو آپؐ نے فرمایا کہ ان کی نرمی و نزاکت اُس جھلّی جیسی ہوگی جو انڈے کے چھلکے اور اس کے گُودے کے درمیان ہوتی ہے۔ (ابنِ جَرِیر)

۳۱- یعنی تم بھی ایسے ضعیف الاعتقاد نکلے کہ زندگی بعدِ موت جیسی بعید از عقل بات کو مان بیٹھے۔

۳۲- اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخرت میں انسان کی سَماعت اور بینائی اور گویائی کس پیمانے کی ہوگی۔ جنت میں بیٹھا ہوا ایک آدمی جب چاہتا ہے، کسی ٹیلی ویژن کے آلے کے بغیر بس یونہی جُھک کر ایک ایسے شخص کو دیکھ لیتا ہے جو اس سے نہ معلوم کتنے ہزار میل کے فاصلے پر جہنّم میں مبتلائے عذاب ہے۔ پھر یہی نہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، بلکہ ان کے درمیان کسی ٹیلیفون یا ریڈیو کے توسُّط کے بغیر براہِ راست کلام بھی ہوتا ہے۔ وہ اتنے طویل فاصلے سے بات کرتے ہیں اور ایک دوسرے

QuranUrdu.com

إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٠﴾ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿٦١﴾
أَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿٦٢﴾ إِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً
لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿٦٣﴾ إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ أَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿٦٤﴾ طَلْعُهَا كَأَنَّهٗ
رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿٦٥﴾ فَإِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا
الْبُطُوْنَ ﴿٦٦﴾ ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿٦٧﴾ ثُمَّ

یقیناً یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔ ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔ بولو، یہ ضیافت اچھی ہے یا زَقّوم[۳۴] کا درخت؟ ہم نے اُس درخت کو ظالموں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے[۳۵]۔ وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہ سے نکلتا ہے۔ اُس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر[۳۶]۔ جہنّم کے لوگ اُسے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے، پھر اس پر پینے کے لیے ان کو کھولتا ہوا پانی ملے گا۔ اور اس کے بعد

کی بات سُنتے ہیں۔

۳۳- اندازِ کلام صاف بتا رہا ہے کہ اپنے اُس دوزخی یار سے کلام کرتے کرتے یکایک یہ جنّتی شخص اپنے آپ سے کلام کرنے لگتا ہے اور یہ تین فقرے اس کی زبان سے اس طرح ادا ہوتے ہیں جیسے کوئی شخص اپنے آپ کو ہر توقع اور ہر اندازے سے برتر حالت میں پا کر انتہائی حیرت واِستِعجاب اور وفورِ مَسَرّت کے ساتھ آپ ہی آپ بول رہا ہو۔ اِس طرح کے کلام میں کوئی خاص شخص مخاطَب نہیں ہوتا، اور نہ اس کلام میں جو سوالات آدمی کرتا ہے ان سے درحقیقت کوئی بات کسی سے پوچھنا مقصود ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں آدمی کے اپنے ہی احساسات کا اظہار اس کی زبان سے ہونے لگتا ہے۔ وہ جنتی شخص اُس دوزخی سے کلام کرتے کرتے یکایک یہ محسوس کرتا ہے کہ میری خوش قسمتی مجھے کہاں لے آئی ہے۔ اب نہ موت ہے نہ عذاب ہے۔ ساری کُلفتوں کا خاتمہ ہو چکا ہے اور مجھے حیاتِ جاوِداں نصیب ہو چکی ہے۔ اسی احساس کی بنا پر وہ بے ساختہ بول اُٹھتا ہے: کیا اب ہم اس مرتبے کو پہنچ گئے ہیں؟

۳۴- زَقّوم ایک قسم کا درخت ہے جو تِہامہ کے علاقے میں ہوتا ہے۔ مزا اس کا تلخ ہوتا ہے، بُو ناگوار ہوتی ہے، اور توڑنے پر اس میں سے دودھ کا سا رَس نکلتا ہے جو اگر جسم کو لگ جائے تو ورم ہو جاتا ہے۔ غالباً یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے ملک میں تھوہر کہتے ہیں۔

۳۵- یعنی منکرین یہ بات سُن کر قرآن پر طعن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر استہزا کا ایک نیا موقع پا لیتے ہیں۔

QuranUrdu.com

اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴿٦٨﴾ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ
ضَآلِّيْنَ ﴿٦٩﴾ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ
اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٧١﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿٧٢﴾
فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿٧٣﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ
الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٧٤﴾ وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿٧٥﴾ وَنَجَّيْنٰهُ ع ۲ ۵۳ ۶

ان کی واپسی اُسی آتشِ دوزخ کی طرف[۳۷] ہوگی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا اور انھی کے نقشِ قدم پر دوڑ چلے[۳۸]۔ حالانکہ ان سے پہلے بہت سے لوگ گمراہ ہو چکے تھے اور اُن میں ہم نے تنبیہ کرنے والے رسول بھیجے تھے۔ اب دیکھ لو کہ اُن تنبیہ کیے جانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ اس بدانجامی سے بس اللہ کے وہی بندے بچے ہیں جنھیں اس نے اپنے لیے خالص کر لیا ہے۔ ع
ہم کو (اِس سے پہلے)[۳۹] نوحؑ نے پکارا تھا[۴۰]، تو دیکھو کہ ہم کیسے اچھے جواب دینے والے تھے۔ ہم نے

وہ اس پر ٹھٹھا مار کر کہتے ہیں: لو اب نئی سنو، جہنّم کی دہکتی ہوئی آگ میں درخت اُگے گا۔

۳۶- کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ شیطان کا سر کس نے دیکھا ہے جو زَقّوم کے شگوفوں کو اس سے تشبیہ دی گئی۔ دراصل یہ تخیلی نوعیت کی تشبیہ ہے اور عام طور پر ہر زبان کے ادب میں اس سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً ہم ایک عورت کی انتہائی خوب صورتی کا تصور دلانے کے لیے کہتے ہیں: وہ پری ہے۔ اور انتہائی بدصورتی بیان کرنے کے لیے کہتے ہیں: وہ چڑیل ہے یا بُھتنی ہے۔ کسی شخص کی نورانی شکل کی تعریف میں کہا جاتا ہے: وہ فرشتہ صورت ہے۔ اور کوئی نہایت بھیانک ہیئتِ کذائی میں سامنے آئے تو دیکھنے والے کہتے ہیں کہ وہ شیطان بنا چلا آ رہا ہے۔

۳۷- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ دوزخ جب بھوک پیاس سے بے تاب ہونے لگیں گے تو انھیں اس مقام کی طرف ہانک دیا جائے گا جہاں زَقّوم کے درخت اور کھَولتے ہوئے پانی کے چشمے ہوں گے۔ پھر جب وہ وہاں سے کھا پی کر فارغ ہو جائیں گے تو انھیں دوزخ کی طرف واپس لایا جائے گا۔

۳۸- یعنی انھوں نے خود اپنی عقل سے کام لے کر کبھی نہ سوچا کہ باپ دادا سے جو طریقہ چلا آ رہا ہے وہ دُرست بھی ہے یا نہیں۔ بس آنکھیں بند کر کے اسی ڈگر پر ہو لیے جس پر دوسروں کو چلتے دیکھا۔

۳۹- اس مضمون کا تعلق پچھلے رُکوع کے آخری فقروں سے ہے۔ ان پر غور کرنے سے سمجھ میں آ جاتا ہے کہ یہ قصّے

QuranUrdu.com

وَ اَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ وَ جَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ
الْبٰقِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۷۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ
فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۹﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّهٗ
مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۱﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۸۲﴾ وَ اِنَّ
مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ﴿۸۳﴾ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۴﴾ اِذْ

وقف لازم

اُس کو اور اُس کے گھر والوں کو کربِ عظیم سے بچا لیا[41]، اور اسی کی نسل کو باقی رکھا[42]، اور بعد کی نسلوں میں اس کی تعریف و توصیف چھوڑ دی۔ سلام ہے نوحؑ پر تمام دنیا والوں میں[43]۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ پھر دوسرے گروہ کو ہم نے غرق کر دیا۔ اور نوحؑ ہی کے طریقے پر چلنے والا ابراہیمؑ تھا۔ جب وہ اپنے رب کے حضور قلبِ سلیم لے کر آیا[44]۔ جب

یہاں کس غرض سے سنائے جا رہے ہیں۔

۴۰- اس سے مراد وہ فریاد ہے جو حضرت نوح علیہ السلام نے مدت ہائے دراز تک اپنی قوم کو دعوتِ دینِ حق دینے کے بعد آخرِ کار مایوس ہو کر اللہ تعالیٰ سے کی تھی۔ اس فریاد کے الفاظ سورۂ قمر میں اس طرح آئے ہیں: فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ، ''اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہو گیا ہوں، اب تُو میری مدد کو پہنچ۔'' (آیت ۱۰)

۴۱- یعنی اُس شدید اذیّت سے جو ایک بدکردار اور ظالم قوم کی مسلسل مخالفت سے اُن کو پہنچ رہی تھی۔ اس میں ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف بھی ہے کہ جس طرح نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو اُس کربِ عظیم سے بچایا گیا، اسی طرح آخرِ کار ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو بھی اِس کربِ عظیم سے بچا لیں گے جس میں اہلِ مکہ نے ان کو مبتلا کر رکھا ہے۔

۴۲- اس کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک، یہ کہ جو لوگ حضرت نوحؑ کی مخالفت کر رہے تھے ان کی نسل دنیا سے ناپید کر دی گئی اور حضرت نوحؑ ہی کی نسل باقی رکھی گئی۔ دوسرے، یہ کہ تمام نسلِ انسانی ختم کر دی گئی اور آگے صرف حضرت نوح علیہ السلام ہی کی اولاد سے دنیا آباد کی گئی۔ عام طور پر مفسرین نے اِسی دوسرے معنیٰ کو اختیار کیا ہے، مگر قرآنِ مجید کے الفاظ اس معنیٰ میں صریح نہیں ہیں، اور حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

۴۳- یعنی آج دنیا میں حضرت نوحؑ کی بُرائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ طوفانِ نوحؑ کے بعد سے آج تک ہزارہا برس سے دنیا ان کا ذکرِ خیر ہی کر رہی ہے۔

QuranUrdu.com

قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا ذَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۸۵﴾ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ
اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ﴿۸۶﴾ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَنَظَرَ نَظْرَةً
فِي النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴿۹۰﴾

اُس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا:[۴۵] "یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کر رہے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھُوٹ گھڑے ہوئے معبُود چاہتے ہو؟ آخر اللہ رب العالمین کے بارے میں تمھارا کیا گمان ہے؟[۴۶]" پھر[۴۷] اس نے تاروں پر ایک نگاہ ڈالی[۴۸] اور کہا: میری طبیعت خراب ہے۔[۴۹] چنانچہ وہ لوگ اسے چھوڑ کر

۴۴ – رب کے حُضور آنے سے مراد اس کی طرف رُجوع کرنا اور سب سے منہ موڑ کر اُسی کا رخ کرنا ہے۔ اور "قلبِ سلیم" کے معنیٰ "صحیح سلامت دل" کے ہیں۔ یعنی ایسا دل جو تمام اعتقادی اور اَخلاقی خرابیوں سے پاک ہو، جس میں کفر و شرک اور شُکوک و شبہات کا شائبہ تک نہ ہو، جس میں نافرمانی اور سرکشی کا کوئی جذبہ نہ پایا جاتا ہو، جس میں کوئی اینچ پیچ اور الجھاؤ نہ ہو، جو ہر قسم کے بُرے مَیلانات اور ناپاک خواہشات سے بالکل صاف ہو، جس کے اندر کسی کے لیے بغض و حسد یا بدخواہی نہ پائی جاتی ہو، جس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہ ہو۔

۴۵ – حضرت ابراہیمؑ کے اِس قصے کی مزید تفصیلات کے لیے مُلاحظہ ہو، تفہیم القرآن، جلد اوّل، الاَنعام، حواشی ۵۰ تا ۵۵۔ جلد سوم، مریم، حواشی ۲۶ – ۲۷، الانبیاء، حواشی ۵۱ تا ۶۶، الشعراء، حواشی ۵۰ تا ۶۴، العنکبوت، حواشی ۲۵ تا ۴۸۔

۴۶ – یعنی اللہ تعالیٰ کو آخر تم نے کیا سمجھ رکھا ہے۔ کیا تمھارا خیال یہ ہے کہ یہ لکڑی پتھر کے معبُود اس کے ہم جنس ہو سکتے ہیں؟ یا اس کی صفات اور اس کے اختیارات میں شریک ہو سکتے ہیں؟ اور کیا تم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ اس کے ساتھ اتنی بڑی گستاخی کر کے تم اس کی پکڑ سے بچے رہ جاؤ گے؟

۴۷ – اب ایک خاص واقعے کا ذکر کیا جا رہا ہے جس کی تفصیلات سورۂ انبیاء (آیات ۵۱ تا ۷۳) اور سورۂ عنکبوت (آیات ۱۶ تا ۲۷) میں گزر چکی ہیں۔

۴۸ – ابن ابی حاتمؒ نے مشہور تابعی مفسر قَتادَہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اہلِ عرب نَظَرَ فِي النُّجُوْمِ (اس نے تاروں پر نگاہ ڈالی) کے الفاظ محاورے کے طور پر اس معنیٰ میں بولا کرتے ہیں کہ اُس شخص نے غور کیا، یا وہ شخص سوچنے لگا۔ علامہ ابنِ کثیرؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور ویسے بھی یہ بات اکثر مشاہدے میں آتی ہے کہ جب کسی شخص کے سامنے کوئی غور طلب معاملہ آتا ہے تو وہ آسمان کی طرف، یا اوپر کی جانب کچھ دیر دیکھتا رہتا ہے، پھر سوچ کر جواب دیتا ہے۔

۴۹ – یہ اُن تین باتوں میں سے ایک ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی زندگی میں یہ تین جھوٹ بولے تھے۔ حالانکہ اس بات کو جھوٹ، یا خلافِ واقعہ کہنے کے لیے پہلے کسی ذریعے سے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ

QuranUrdu.com

فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾
فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْيَمِيْنِ ﴿۹۳﴾ فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ﴿۹۴﴾ قَالَ
اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوا
ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِى الْجَحِيْمِ ﴿۹۷﴾ فَاَرَادُوْا بِهٖ

چلے گئے[۵۰]۔ اُن کے پیچھے وہ چُپکے سے اُن کے معبُودوں کے مَنْدِر میں گُھس گیا اور بولا: ”آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں ہیں[۵۱]؟ کیا ہو گیا، آپ لوگ بولتے بھی نہیں؟“ اس کے بعد وہ اُن پر پِل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں۔ (واپس آ کر) وہ لوگ بھاگے بھاگے اس کے پاس آئے[۵۲]۔ اس نے کہا: ”کیا تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پُوجتے ہو؟ حالانکہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور اُن چیزوں کو بھی جنھیں تم بناتے ہو۔“ انھوں نے آپس میں کہا: ”اس کے لیے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو۔“ انھوں نے اس کے خلاف

اُس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ تھی اور انھوں نے محض بہانے کے طور پر یہ بات بنا دی تھی۔ اگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے تو خواہ مخواہ اسے جھوٹ آخر کس بنا پر قرار دے دیا جائے۔ اس مسئلے پر تفصیلی بحث ہم تفہیم القرآن جلد سوم (الانبیاء، حاشیہ ۶۰) میں کر چکے ہیں، اور مزید بحث رسائل و مسائل، جلد دوم (صفحہ ۳۵ تا ۳۹) میں کی گئی ہے۔

۵۰ - یہ فقرہ خود بخود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ صورتِ معاملہ دراصل کیا تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوم کے لوگ اپنے کسی میلے میں جا رہے ہوں گے۔ حضرت ابراہیمؑ کے خاندان والوں نے اُن سے بھی ساتھ چلنے کو کہا ہوگا۔ انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی ہوگی کہ میری طبیعت خراب ہے، میں نہیں چل سکتا۔ اب اگر یہ بات بالکل ہی خلافِ واقعہ ہوتی تو ضرور گھر کے لوگ اُن سے کہتے کہ اچھے خاصے بھلے چنگے ہو، بلاوجہ بہانہ بنا رہے ہو۔ لیکن جب وہ اس عذر کو قبول کر کے انھیں پیچھے چھوڑ گئے تو اس سے خود ہی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ضرور اُس وقت حضرت ابراہیمؑ کو نزلہ، کھانسی، یا کوئی اور ایسی ہی نمایاں تکلیف ہوگی جس کی وجہ سے گھر والے انھیں چھوڑ جانے پر راضی ہو گئے۔

۵۱ - اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مَندِر میں بتوں کے سامنے طرح طرح کی کھانے کی چیزیں رکھی ہوئی ہوں گی۔

۵۲ - یہاں قصہ مختصر کر کے بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ انبیاء میں اس کی جو تفصیل دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جب انھوں نے آ کر اپنے مندِر میں دیکھا کہ سارے بت ٹوٹے پڑے ہیں تو پوچھ گچھ شروع کی۔ کچھ لوگوں نے بتایا کہ ابراہیم نامی ایک نوجوان بُت پرستی کے خلاف ایسی ایسی باتیں کرتا رہا ہے۔ اس پر مجمع نے کہا کہ پکڑ لاؤ اُسے۔ چنانچہ ایک گروہ دوڑتا ہوا ان کے پاس پہنچا، اور انھیں مجمع کے سامنے لے آیا۔

QuranUrdu.com

كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ
سَيَهْدِيْنِ ﴿۹۹﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ فَبَشَّرْنٰهُ
بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ

ایک کارروائی کرنی چاہی تھی، مگر ہم نے انھی کو نیچا دکھا دیا۔[۵۳]
ابراہیمؑ نے کہا:[۵۴] ''میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں[۵۵]، وہی میری رہنمائی کرے گا۔
اے پروردگار! مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو۔[۵۶]'' (اس دُعا کے جواب میں)
ہم نے اس کو ایک حلیم (بُردبار) لڑکے کی بشارت دی۔[۵۷] وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دَوڑ
دُھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیمؑ نے اس سے کہا: ''بیٹا! میں

۵۳ - سورۂ انبیاء (آیت ۶۹) میں الفاظ یہ ہیں: قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (ہم نے کہا: اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ کے لیے۔) اور سورۂ عنکبوت (آیت ۲۴) میں ارشاد ہوا ہے: فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ (پھر اللہ نے اس کو آگ سے بچا لیا۔) اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینک دیا تھا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں اُس سے بسلامت نکال دیا۔ آیت کے یہ الفاظ کہ ''انھوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی مگر ہم نے انھیں نیچا دکھا دیا''، اس معنی میں نہیں لیے جا سکتے کہ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکنا چاہا تھا مگر نہ پھینک سکے۔ بلکہ مذکورۂ بالا آیات کے ساتھ ملا کر دیکھنے سے ان کا صاف مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ آگ میں پھینک کر انھیں ہلاک کر دینا چاہتے تھے مگر نہ کر سکے، اور ان کے معجزانہ طریقے سے بچ جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی برتری ثابت ہوگئی اور مشرکین کو اللہ نے نیچا دکھا دیا۔ اس واقعے کو بیان کرنے سے اصل مقصود قریش کے لوگوں کو اس بات پر مُتَنَبِّہ کرنا ہے کہ جن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے پر تم فخر کرتے ہو اُن کا طریقہ وہ نہ تھا جو تم نے اختیار کر رکھا ہے، بلکہ وہ تھا جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں۔ اب اگر تم اِن کو نیچا دکھانے کے لیے وہ چالیں چلو گے جو حضرت ابراہیمؑ کی قوم نے اُن کے ساتھ چلی تھیں تو آخرِ کار نیچا تم ہی دیکھو گے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نیچا تم نہیں دکھا سکتے۔

۵۴ - یعنی آگ سے بسلامت نکل آنے کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ نے ملک سے نکل جانے کا فیصلہ کیا تو چلتے وقت یہ الفاظ کہے۔

۵۵ - اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ کی خاطر نکل رہا ہوں کیونکہ اسی کا ہو جانے کی وجہ سے میری قوم میری دشمن ہوگئی ہے ورنہ کوئی دنیوی جھگڑا میرے اور اس کے درمیان نہ تھا کہ اس کی بنا پر مجھے اپنا وطن چھوڑنا پڑ رہا ہو۔ نیز یہ کہ میرا دنیا میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے جس کا رخ کروں۔ تن بتقدیر بس اللہ کے بھروسے پر نکل رہا ہوں۔ جدھر وہ لے جائے گا اسی طرف چلا جاؤں گا۔

۵۶ - اس دعا سے خود بخود یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اُس وقت بے اولاد تھے۔ قرآنِ مجید میں دوسرے مقامات پر جو حالات بیان کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صرف ایک بیوی اور ایک بھتیجے (حضرت لوطؑ) کو لے کر

QuranUrdu.com

اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی ؕ قَالَ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ
مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۰۲﴾ فَلَمَّآ

خواب میں دیکھتا ہوں کہ مَیں تجھے ذبح کر رہا ہوں[۵۸]، اب تُو بتا، تیرا کیا خیال ہے[۵۹]؟" اُس نے کہا: "ابا جان! جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے[۶۰] اُسے کر ڈالیے، آپ اِنْ شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔" آخر کو جب

ملک سے نکلے تھے۔ اس وقت فطرتاً آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اللہ کوئی صالح اولاد عطا فرمائے جو اس غریب الوطنی کی حالت میں آپ کا غم غلط کرے۔

۵۷ - اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ دُعا کرتے ہی یہ بشارت دے دی گئی۔ قرآنِ مجید ہی میں ایک دوسرے مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ۔ "شکر ہے اُس خدا کا جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے۔" (سورۂ ابراہیم، آیت ۳۹) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور اس بشارت کے درمیان سالہا سال کا فصل تھا۔ بائبل کا بیان ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ برس کی تھی (پیدائش، ۱۶:۱۶)، اور حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کے وقت سو برس کی۔ (۵:۲۱)

۵۸ - یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں یہ نہیں دیکھا تھا کہ انھوں نے بیٹے کو ذبح کر دیا ہے، بلکہ یہ دیکھا تھا کہ وہ اُسے ذبح کر رہے ہیں۔ اگرچہ اُس وقت وہ خواب کا مطلب یہی سمجھے تھے کہ وہ صاحبزادے کو ذبح کر دیں۔ اسی بنا پر وہ ٹھنڈے دل سے بیٹا قربان کر دینے کے لیے بالکل تیار ہو گئے تھے۔ مگر خواب دکھانے میں جو باریک نکتہ اللہ تعالیٰ نے ملحوظ رکھا تھا اُسے آگے کی آیت نمبر ۱۰۵ میں اس نے خود کھول دیا ہے۔

۵۹ - صاحبزادے سے یہ بات پوچھنے کا مدّعا یہ نہ تھا کہ تُو راضی ہو تو خدا کے فرمان کی تعمیل کروں ورنہ نہ کروں۔ بلکہ حضرت ابراہیمؑ دراصل یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ جس صالح اولاد کی انھوں نے دعا مانگی تھی، وہ فی الواقع کس قدر صالح ہے۔ اگر وہ خود بھی اللہ کی خوشنودی پر جان قربان کر دینے کے لیے تیار ہے تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ دعا مکمل طور پر قبول ہوئی ہے اور بیٹا محض جسمانی حیثیت ہی سے ان کی اولاد نہیں ہے بلکہ اَخلاقی و روحانی حیثیت سے بھی ان کا سپوت ہے۔

۶۰ - یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ پیغمبر باپ کے خواب کو بیٹے نے محض خواب نہیں بلکہ خدا کا حکم سمجھا تھا۔ اب اگر یہ فی الواقع حکم نہ ہوتا تو ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ صراحتاً یا اشارتاً اس امر کی تصریح فرما دیتا کہ فرزندِ ابراہیمؑ نے غلط فہمی سے اس کو حکم سمجھ لیا۔ لیکن پورا سیاق و سباق ایسے کسی اشارے سے خالی ہے۔ اسی بنا پر اسلام میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ انبیاؑ کا خواب محض خواب نہیں ہوتا بلکہ وہ بھی وحی کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔ ظاہر ہے کہ جس بات سے ایک اتنا بڑا قاعدہ خدا کی شریعت میں شامل ہو سکتا ہو، وہ اگر مبنی بر حقیقت نہ ہوتی بلکہ محض ایک غلط فہمی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کی تردید نہ فرماتا۔ قرآن کو کلامِ الٰہی ماننے والے کے لیے یہ تسلیم کرنا محال ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسی بھول چوک بھی صادر ہو سکتی ہے۔

QuranUrdu.com

اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴿۱۰۳﴾ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰاِبْرٰهِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ قَدْ صَدَّقْتَ
الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ
الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ﴿۱۰۶﴾ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۷﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ

اِن دونوں نے سرِتسلیم خم کردیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بَل گرا دیا[61] اور ہم نے نِدا دی[62] کہ "اے ابراہیمؑ! تو نے خواب سچ کردکھایا[63]۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں[64]۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی[65]۔" اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چُھڑا لیا[66]۔ اور اس کی تعریف و توصیف

۶۱ – یعنی حضرت ابراہیمؑ نے ذبح کرنے کے لیے بیٹے کو چت نہیں لٹایا بلکہ اَوندھے منہ لٹایا، تاکہ ذبح کرتے وقت بیٹے کا چہرہ دیکھ کر کہیں محبّت وشفقت ہاتھ میں لرزش پیدا نہ کردے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ نیچے کی طرف سے ہاتھ ڈال کر چھری چلائیں۔

۶۲ – نحویوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ یہاں "اور" بمعنیٰ "تو" ہے، یعنی فقرہ یوں ہے کہ "جب ان دونوں نے سرِتسلیم خم کردیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا تو ہم نے نِدا دی۔" لیکن ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہاں لفظ "جب" کا جواب محذوف ہے اور اس کو ذہنِ سامع پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کیونکہ بات اتنی بڑی تھی کہ اسے الفاظ میں بیان کرنے کے بجائے تصور ہی کے لیے چھوڑ دینا زیادہ مناسب تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے دیکھا ہوگا کہ بوڑھا باپ اپنے ارمانوں سے مانگے ہوئے بیٹے کو محض ہماری خوشنودی پر قربان کردینے کے لیے تیار ہوگیا ہے اور بیٹا بھی گلے پر چُھری چلوانے کے لیے راضی ہے، تو یہ منظر دیکھ کر کیسا کچھ دریائے رحمت نے جوش مارا ہوگا، اور مالک کو ان باپ بیٹوں پر کیسا کچھ پیار آیا ہوگا، اس کا بس تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ الفاظ میں اُس کی کیفیت جتنی کچھ بھی بیان کی جائے گی وہ اس کو ادا نہیں کرے گی بلکہ اس کی اصلی شان سے کچھ گھٹ کر ہی ہوگی۔

۶۳ – یعنی ہم نے تمھیں یہ تو نہیں دکھایا تھا کہ تم نے بیٹے کو ذبح کردیا ہے اور اُس کی جان نکل گئی ہے، بلکہ یہ دکھایا تھا کہ تم ذبح کر رہے ہو۔ تو وہ خواب تم نے پورا کر دکھایا۔ اب ہمیں تمھارے بچے کی جان لینی مطلوب نہیں ہے۔ اصل مدّعا جو کچھ تھا، وہ تمھاری اس آمادگی اور تیاری سے حاصل ہوگیا ہے۔

۶۴ – یعنی جو لوگ احسان کی رَوِش اختیار کرتے ہیں ان کے اوپر آزمائشیں ہم اس لیے نہیں ڈالا کرتے کہ انھیں خواہ مخواہ تکلیفوں میں ڈالیں اور رنج وغم میں مبتلا کریں۔ بلکہ یہ آزمائشیں ان کی فضیلتوں کو اُبھارنے کے لیے اور انھیں بڑے مرتبے عطا کرنے کے لیے ان پر ڈالی جاتی ہیں، اور پھر آزمائش کی خاطر جس مخمصے میں ہم انھیں ڈالتے ہیں اس سے بخیریت اُن کو نکلوا بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ دیکھو، بیٹے کی قربانی کے لیے تمھاری آمادگی وتیاری ہی بس اس کے لیے کافی ہوگئی کہ تمھیں وہ مرتبہ عطا کردیا جائے جو ہماری خوشنودی پر واقعی بیٹا قربان کردینے والے کو مل سکتا تھا۔ اس طرح ہم نے تمھارے بچے کی جان بھی بچادی اور تمھیں یہ

QuranUrdu.com

فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۱۰۹﴾ كَذٰلِكَ نَجْزِي
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَبَشَّرْنٰهُ
بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ؕ

ہمیشہ کے لیے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی۔ سلام ہے ابراہیمؑ پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ اور ہم نے اسے اسحاقؑ کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے۔ اور اسے اور اسحاقؑ کو برکت دی[۶۷]

مرتبۂ بلند بھی عطا کر دیا۔

۶۵ – یعنی مقصود تمھارے ہاتھ سے تمھارے بچے کو ذبح کرا دینا نہ تھا، بلکہ اصل مقصود تمھارا امتحان لینا تھا کہ تم ہمارے مقابلے میں دنیا کی کسی چیز کو عزیز تر تو نہیں رکھتے۔

۶۶ – ''بڑی قربانی'' سے مراد، جیسا کہ بائبل اور اسلامی رِوایات میں بیان ہوا ہے، ایک مینڈھا ہے جو اُس وقت اللہ تعالیٰ کے فرشتے نے حضرت ابراہیمؑ کے سامنے پیش کیا، تاکہ بیٹے کے بدلے اس کو ذبح کر دیں۔ اسے بڑی قربانی کے لفظ سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ وہ ابراہیمؑ جیسے وفادار بندے کے لیے فرزندِ ابراہیمؑ جیسے صابر و جاں نثار لڑکے کا فدیہ تھا، اور اسے اللہ تعالیٰ نے ایک بے نظیر قربانی کی نیت پوری کرنے کا وسیلہ بنایا تھا۔ اس کے علاوہ اُسے ''بڑی قربانی'' قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سنّت جاری کر دی کہ اُسی تاریخ کو تمام اہلِ ایمان دنیا بھر میں جانور قربان کریں اور وفاداری و جاں نثاری کے اس عظیم الشان واقعے کی یاد تازہ کرتے رہیں۔

۶۷ – یہاں پہنچ کر یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے جن صاحبزادے کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوئے تھے اور جنھوں نے اپنے آپ کو خود اس قربانی کے لیے پیش کر دیا تھا، وہ کون تھے۔ سب سے پہلے اس سوال کا جواب ہمارے سامنے بائبل کی طرف سے آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ:

''خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اُسے کہا: اَے ابرہام!..... تو اپنے بیٹے اِضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریّاہ کے مُلک میں جا اور وہاں اُسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ، پر جو میں تجھے بتاؤں گا، سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔'' (پیدایش، ۲۲:۱-۲)

اس بیان میں ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاقؑ کی قربانی مانگی تھی، اور دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ اِکلَوتے تھے۔ حالانکہ خود بائبل ہی کے دوسرے بیانات سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسحاقؑ اِکلَوتے نہ تھے۔ اس کے لیے ذرا بائبل ہی کی حسبِ ذیل تصریحات مُلاحظہ ہوں:

''اور اِبرام کی بیوی سارَی کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اُس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔

QuranUrdu.com

اور سارَی نے اِبرام سے کہا کہ دیکھ، خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے، سو تو میری لونڈی کے پاس جا، شاید اس سے میرا گھر آباد ہو۔ اور اِبرام نے سارَی کی بات مانی۔ اور اِبرام کو مُلکِ کنعان میں رہتے دس برس ہو گئے تھے جب اُس کی بیوی سارَی نے اپنی مصری لونڈی اُسے دی کہ اُس کی بیوی بنے اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی۔" (پیدائش، ۱۶: ۱-۳)

"اور خداوند کے فرشتے نے اُس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا ہوگا۔ اُس کا نام اسمٰعیل رکھنا۔" (۱۶: ۱۱)

"اور جب اِبرام سے ہاجرہ کے اسمٰعیل پیدا ہوا تب اِبرام چھیاسی برس کا تھا۔" (۱۶: ۱۶)

"اور خدا نے ابرہام سے کہا کہ سارَی جو تیری بیوی ہے...... اُس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا...... تو اُس کا نام اِضحاق رکھنا...... جو اگلے سال اِسی وقتِ مُعَیّن پر سارہ سے پیدا ہوگا...... تب ابرہام نے اپنے بیٹے اسمٰعیل کو اور...... گھر کے سب مردوں کو لیا اور اُسی روز خدا کے حکم کے مطابق اُن کا ختنہ کیا۔ ابرہام ننّانوے برس کا تھا جب اس کا ختنہ ہوا، اور جب اُس کے بیٹے اسمٰعیل کا ختنہ ہوا تو وہ تیرہ برس کا تھا۔" (پیدائش، ۱۷: ۱۵-۲۵)

"اور جب اُس کا بیٹا اِضحاق اُس سے پیدا ہوا تو ابرہام سو برس کا تھا۔" (پیدائش، ۲۱: ۵)

اس سے بائبل کی تضاد بیانی صاف کُھل جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۴ برس تک تنہا حضرت اسماعیلؑ ہی حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے تھے۔ اب اگر قربانی اِکلوتے بیٹے کی مانگی گئی تھی تو وہ حضرت اسحاقؑ کی نہیں بلکہ حضرت اسماعیلؑ کی تھی۔ کیونکہ وہی اکلوتے تھے۔ اور اگر حضرت اسحاقؑ کی قربانی مانگی گئی تھی تو پھر یہ کہنا غلط ہے کہ اکلوتے بیٹے کی قربانی مانگی گئی تھی۔

اس کے بعد ہم اسلامی روایات کو دیکھتے ہیں اور ان میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ مفسرین نے صحابہؓ و تابعینؒ کی جو رِوایات نقل کی ہیں ان میں ایک گروہ کا قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحاقؑ تھے، اور اس گروہ میں حسبِ ذیل بزرگوں کے نام ملتے ہیں:

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت عباسؓ بن عبد المُطّلب، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابو ہُریرہؓ، قتادہؒ، عِکرِمہؒ، حَسَن بصریؒ، سعید بن جُبَیرؒ، مجاہدؒ، شَعبیؒ، مَسرُوقؒ، مکحولؒ، زُہریؒ، عطاؒ، مُقاتلؒ، سُدّیؒ، کعبِ اَحبارؒ، زید بن اسلمؒ وغیرہم۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ حضرت اسماعیلؑ تھے۔ اور اس گروہ میں حسبِ ذیل بزرگوں کے نام نظر آتے ہیں:

حضرت ابو بکرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت معاویہؓ، عِکرِمہؒ، مُجاہدؒ، یوسف بن مہرانؒ، حَسَن بصریؒ، محمد بن کعب القُرظیؒ، شَعبیؒ، سعید بن المُسیَّبؒ، ضَحّاکؒ، محمد بن علی بن حسینؒ (محمد الباقر)، ربیع بن اَنَسؒ، احمد بن حنبلؒ وغیرہم۔

ان دونوں فہرستوں کا تقابُل کیا جائے تو متعدِّد نام ان میں مشترک نظر آئیں گے۔ یعنی ایک ہی بزرگ سے دو مختلف قول

QuranUrdu.com

منقول ہوئے ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عبّاسؓ سے عِکْرِمہؒ یہ قول نقل کرتے ہیں کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحاقؑ تھے۔ مگر انھی سے عطاء بن ابی رَباحؒ یہ بات نقل کرتے ہیں کہ زعمت الیھود انہ اسحٰق و کذبت الیھود (یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اسحاقؑ تھے، مگر یہودی جھوٹ کہتے ہیں۔) اسی طرح حضرت حَسَن بصریؒ سے ایک رِوایَت یہ ہے کہ وہ حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کے قائل تھے۔ مگر عَمْرو بن عُبَیدؒ کہتے ہیں کہ حسن بصریؒ کو اس امر میں کوئی شک نہیں تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے جس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا، وہ اسماعیل علیہ السلام تھے۔

اِس اختلافِ رِوایات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ علمائے اسلام میں سے بعض پورے جَزْم و وثوق کے ساتھ حضرت اسحاق علیہ السلام کے حق میں رائے دیتے ہیں، مثلاً ابنِ جَرِیر اور قاضی عِیاض۔ اور بعض قطعی طور پر حکم لگاتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے، مثلاً ابنِ کثیرؒ۔ اور بعض مُذَبْذَب ہیں، مثلاً جلال الدین سُیُوطیؒ۔ لیکن اگر تحقیق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ امر ہر شک وشبہ سے بالاتر نظر آتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ ہی ذبیح تھے۔ اس کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:

۱- اُوپر قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گزر چکا ہے کہ اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ نے ایک صالح بیٹے کے لیے دُعا کی تھی اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک حلیم لڑکے کی بشارت دی۔ فَحوائے کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ دُعا اُس وقت کی گئی تھی جب آپ بے اولاد تھے۔ اور بشارت جس لڑکے کی دی گئی وہ آپ کا پہلونٹا بچہ تھا۔ پھر یہ بھی قرآن ہی کے سلسلۂ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہی بچہ جب باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا اشارہ فرمایا گیا۔ اب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے پہلونٹے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ تھے نہ کہ حضرت اسحاقؑ۔ خود قرآن مجید میں صاحبزادوں کی ترتیب اس طرح بیان ہوئی ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ۔ (ابراہیم، آیت ۳۹)

۲- قرآنِ مجید میں جہاں حضرت اسحاقؑ کی بشارت دی گئی ہے وہاں اُن کے لیے غلامِ عَلیم (علم والے لڑکے) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں: وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ (الذاریات، ۲۸) لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ (الحجر، ۵۳) مگر یہاں جس لڑکے کی بشارت دی گئی ہے اُس کے لیے غلام حلیم (بُردبار لڑکے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صاحبزادوں کی دو نمایاں صفات الگ الگ تھیں۔ اور ذبح کا حکم غلامِ علیم کے لیے نہیں بلکہ غلامِ حلیم کے لیے تھا۔

۳- قرآنِ مجید میں حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کی خوش خبری دیتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ یہ خوشخبری بھی دے دی گئی تھی کہ ان کے ہاں یعقوبؑ جیسا بیٹا پیدا ہوگا۔ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ۔ (ہود، ۷۱) اب ظاہر ہے کہ جس بیٹے کی پیدائش کی خبر دینے کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دی جا چکی ہو کہ اس کے ہاں ایک لائق لڑکا پیدا ہوگا، اس کے متعلق اگر حضرت ابراہیمؑ کو یہ خواب دکھایا جاتا کہ آپ اسے ذبح کر رہے ہیں، تو حضرت ابراہیمؑ اس سے کبھی یہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ اس بیٹے کو قربان کر دینے کا اشارہ فرمایا جا رہا ہے۔ علامہ ابنِ جَرِیرؒ اس دلیل کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ممکن ہے یہ خواب حضرت ابراہیمؑ کو اس وقت دکھایا گیا ہو جب حضرت اسحاقؑ کے ہاں حضرت یعقوبؑ پیدا ہو چکے ہوں۔ لیکن درحقیقت یہ اس دلیل کا نہایت ہی بودا جواب ہے۔ قرآنِ مجید کے الفاظ یہ ہیں کہ ”جب وہ لڑکا باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہو گیا“ تب یہ خواب دکھایا گیا تھا۔ ان الفاظ کو جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر پڑھے گا اس کے سامنے آٹھ دس برس کے بچے کی تصویر آئے گی۔ کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ جوان صاحبِ اولاد بیٹے کے لیے یہ الفاظ

QuranUrdu.com

استعمال کیے گئے ہوں گے۔

۴- اللہ تعالیٰ سارا قصہ بیان کرنے کے بعد آخر میں فرماتا ہے کہ ''ہم نے اسے اسحاقؑ کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے۔'' اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی بیٹا نہیں ہے جسے ذبح کرنے کا اشارہ کیا گیا تھا، بلکہ پہلے کسی اور بیٹے کی بشارت دی گئی۔ پھر جب وہ باپ کے ساتھ دَوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ پھر جب حضرت ابراہیمؑ اس امتحان میں کامیاب ہو گئے تب ان کو ایک اَور بیٹے اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی۔ یہ ترتیبِ واقعات قطعی طور پر فیصلہ کر دیتی ہے کہ جن صاحبزادے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ حضرت اسحاقؑ نہ تھے، بلکہ وہ ان سے کئی برس پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ علامہ ابنِ جَریرؒ اس صریح دلیل کو یہ کہہ کر ردّ کر دیتے ہیں کہ پہلے صرف حضرت اسحاقؑ کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی۔ پھر جب وہ خدا کی خوشنودی پر قربان ہونے کے لیے تیار ہو گئے تو اس کا انعام اس شکل میں دیا گیا کہ ان کے نبی ہونے کی خوشخبری دی گئی۔ لیکن یہ ان کے پہلے جواب سے بھی زیادہ کمزور جواب ہے۔ اگر فی الواقع بات یہی ہوتی تو اللہ تعالیٰ یوں نہ فرماتا کہ ''ہم نے اس کو اسحاقؑ کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے۔'' بلکہ یوں فرماتا کہ ہم نے اس کو یہ بشارت دی کہ تمھارا یہی لڑکا ایک نبی ہوگا صالحین میں سے۔

۵- معتبر رِوایات سے یہ ثابت ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے فدیے میں جو مینڈھا ذبح کیا گیا تھا، اس کے سینگ خانۂ کعبہ میں حضرت عبداللہ بن زُبَیرؓ کے زمانے تک محفوظ تھے۔ بعد میں جب حجّاج بن یوسُف نے حرم میں ابنِ زبیرؓ کا محاصرہ کیا اور خانۂ کعبہ کو مسمار کر دیا تو وہ سینگ بھی ضائع ہو گئے۔ ابنِ عباسؓ اور عامر شَعْبی دونوں اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ انھوں نے خود خانۂ کعبہ میں یہ سینگ دیکھے ہیں۔ (ابنِ کثیر) یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قربانی کا یہ واقعہ شام میں نہیں بلکہ مکۂ معظّمہ میں پیش آیا تھا، اور حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ پیش آیا تھا، اسی لیے تو حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے تعمیر کردہ خانۂ کعبہ میں اس کی یادگار محفوظ رکھی گئی تھی۔

۶- یہ بات صدیوں سے عرب کی رِوایات میں محفوظ تھی کہ قربانی کا یہ واقعہ مِنٰی میں پیش آیا تھا۔ اور یہ صرف رِوایَت ہی نہ تھی بلکہ اُس وقت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک مَناسکِ حج میں یہ کام بھی برابر شامل چلا آ رہا تھا کہ اُسی مَقامِ مِنٰی میں جا کر لوگ اُسی جگہ پر جہاں حضرت ابراہیمؑ نے قربانی کی تھی، جانور قربان کیا کرتے تھے۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپؐ نے بھی اس طریقے کو جاری رکھا، حتّٰی کہ آج تک حج کے موقع پر دس ذِی الحجہ کو مِنٰی میں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ ساڑھے چار ہزار برس کا یہ متواتر عمل اس امر کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس قربانی کے وارث بنی اسماعیلؑ ہوئے ہیں نہ کہ بنی اسحاقؑ۔ حضرت اسحاقؑ کی نسل میں ایسی کوئی رسم کبھی جاری نہیں رہی ہے جس میں ساری قوم بیک وقت قربانی کرتی ہو اور اسے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یادگار کہتی ہو۔

یہ ایسے دلائل ہیں جن کو دیکھنے کے بعد یہ بات قابلِ تعجب نظر آتی ہے کہ خود اُمّتِ مُسْلِمَہ میں حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کا خیال آخر پھیل کیسے گیا۔ یہودیوں نے اگر حضرت اسماعیلؑ کو اس شرف سے محروم کر کے اپنے دادا حضرت اسحاقؑ کی طرف اسے منسوب کرنے کی کوشش کی تو یہ ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ لیکن آخر مسلمانوں کے ایک گروہِ کثیر نے ان کی اس دھاندلی کو کیسے قبول کر لیا؟ اس سوال کا بہت شافی جواب علّامہ ابنِ کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے، مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ سارے اقوال (جو حضرت اسحاقؑ کے ذبیح ہونے کے حق میں ہیں) کعبِ اَحبار سے منقول ہیں۔ یہ صاحب جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں

QuranUrdu.com

وَ مِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ﴿۱۱۳﴾ ع

اب ان دونوں کی ذرّیّت میں سے کوئی مُحسن ہے اور کوئی اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والا ہے۔ ۶۸ ع

مسلمان ہوئے تو کبھی کبھی یہ یہود و نصاریٰ کی قدیم کتابوں کے مُندَرَجات ان کو سنایا کرتے تھے اور حضرت عمرؓ انھیں سُن لیا کرتے تھے۔ اس بنا پر دوسرے لوگ بھی ان کی باتیں سننے لگے اور سب رَطب و یابِس جو وہ بیان کرتے تھے انھیں رِوایَت کرنے لگے۔ حالانکہ اِس اُمّت کو ان کے اس ذخیرۂ معلومات میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت نہ تھی۔''

اس سوال پر مزید روشنی محمد بن کعب قُرَظیؒ کی ایک رِوایَت سے پڑتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میری موجودگی میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہاں یہ سوال چھڑا کہ ذبیح حضرت اسحاقؑ تھے یا حضرت اسماعیلؑ۔ اُس وقت ایک ایسے صاحب بھی مجلس میں موجود تھے جو پہلے یہودی علما میں سے تھے اور بعد میں سچے دل سے مسلمان ہو چکے تھے۔ انھوں نے کہا: ''امیر المومنین! خدا کی قسم وہ اسماعیلؑ ہی تھے، اور یہودی اس بات کو جانتے ہیں، مگر وہ عربوں سے حسد کی بنا پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسحاقؑ تھے۔'' (ابنِ جَرِیر) ان دونوں باتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ دراصل یہ یہودی پروپیگنڈے کا اثر تھا جو مسلمانوں میں پھیل گیا، اور مسلمان چونکہ علمی معاملات میں ہمیشہ غیر مُتعَصِّب رہے ہیں، اس لیے ان میں سے بہت سے لوگوں نے یہودیوں کے ان بیانات کو، جو وہ قدیم صحیفوں کے حوالے سے تاریخی روایات کے بھیس میں پیش کرتے تھے، محض ایک علمی حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا اور یہ محسوس نہ کیا کہ اس میں علم کے بجائے تعصُّب کارفرما ہے۔

۶۸ - یہ فقرہ اُس پورے مقصد پر روشنی ڈالتا ہے جس کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کا یہ قصہ یہاں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹوں کی نسل سے دو بہت بڑی قومیں پیدا ہوئیں۔ ایک بنی اسرائیل، جن کے گھر سے دنیا کے دو بڑے مذہب (یہودیت اور نَصرانیت) نکلے اور انھوں نے رُوئے زمین کے بہت بڑے حصّے کو حلقہ بگوش بنایا۔ دوسرے بنی اسماعیل جو نُزولِ قرآن کے وقت تمام اہلِ عرب کے مقتدا و پیشوا تھے، اور اُس وقت مکۂ معظّمہ کے قبیلۂ قریش کو اُن میں سب سے زیادہ اہم مقام حاصل تھا۔ نسلِ ابراہیمی کی ان دونوں شاخوں کو جو کچھ بھی عُروج نصیب ہوا وہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ان دو عظیم المرتبت صاحبزادوں کے ساتھ انتساب کی بدولت ہوا، ورنہ دنیا میں نہ معلوم ایسے ایسے کتنے خاندان پیدا ہوئے ہیں اور گوشۂ گمنامی میں جا پڑے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ اس خاندان کی تاریخ کا سب سے زیادہ زرّیں کارنامہ سنانے کے بعد ان دونوں گروہوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ تمھیں دنیا میں یہ جو کچھ شرف نصیب ہوا ہے وہ خدا پرستی اور اخلاص و فِدویّت کی اُن شان دار رِوایات کی وجہ سے ہوا ہے جو تمھارے باپ دادا ابراہیم و اسماعیل اور اسحاق علیہم السلام نے قائم کی تھیں۔ وہ انھیں بتاتا ہے کہ ہم نے اُن کو جو برکت عطا فرمائی اور ان پر اپنے فضل و کرم کی جو بارشیں برسائیں، یہ کوئی اندھی بانٹ نہ تھی کہ بس یونہی ایک شخص اور اس کے دو لڑکوں کو چھانٹ کر نواز دیا گیا ہو، بلکہ انھوں نے اپنے مالکِ حقیقی کے ساتھ اپنی وفاداری کے کچھ ثبوت دیے تھے اور ان کی بنا پر وہ اِن عنایات کے مستحق بنے تھے۔ اب تم لوگ محض اس فخر کی بنا پر کہ تم ان کی اولاد ہو، ان عنایات کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ ہم تو یہ دیکھیں گے کہ تم میں سے مُحسن کون ہے اور ظالم کون۔ پھر جو جیسا ہو گا، اُس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کریں گے۔

QuranUrdu.com

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ
الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۱۵﴾ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَاٰتَيْنٰهُمَا
الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۱۸﴾ وَتَرَكْنَا
عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ
نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاِنَّ
اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

اور ہم نے موسیٰؑ و ہارونؑ پر احسان کیا، اُن کو اور ان کی قوم کو کربِ عظیم سے نجات[۶۹] دی، اُنھیں نصرت بخشی جس کی وجہ سے وہی غالب رہے، اُن کو نہایت واضح کتاب عطا کی، انھیں راہِ راست دکھائی، اور بعد کی نسلوں میں ان کا ذکرِ خیر باقی رکھا۔ سلام ہے موسیٰؑ اور ہارونؑ پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں، درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔

اور الیاسؑ بھی یقیناً مُرسلین میں سے[۷۰] تھا۔ یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "تم لوگ ڈرتے نہیں ہو؟

---

۶۹ - یعنی اس شدید مصیبت سے جس میں وہ فرعون اور اس کی قوم کے ہاتھوں مبتلا تھے۔

۷۰ - حضرت الیاس علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے۔ ان کا ذکر قرآنِ مجید میں صرف دو ہی مقامات پر آیا ہے۔ ایک یہ مقام، اور دوسرا سورۂ اَنعام آیت ۸۵۔ موجودہ زمانے کے محققین ان کا زمانہ ۸۷۵ اور ۸۵۰ ق م کے درمیان متعیّن کرتے ہیں۔ وہ جِلعاد کے رہنے والے تھے (قدیم زمانے میں جِلعاد اس علاقے کو کہتے تھے جو آج کل موجودہ ریاست اُردُن کے شمالی اضلاع پر مشتمل ہے اور دریائے یَرمُوک کے جنوب میں واقع ہے۔) بائبل میں ان کا ذکر ایلیاہ تِشبی (Elijah the Tishbite) کے نام سے کیا گیا ہے۔ ان کے مختصر حالات حسبِ ذیل ہیں:

حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے رَحُبعام (Rehoboam) کی نا اہلی کے باعث بنی اسرائیل کی سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ایک حصّہ جو بیت المَقدِس اور جنوبی فلسطین پر مشتمل تھا، آلِ داؤد کے قبضے میں رہا، اور دوسرا حصہ جو شمالی فلسطین پر مشتمل تھا، اس میں ایک مستقل ریاست اسرائیل کے نام سے قائم ہو گئی اور بعد میں سامریہ اس کا صدر مقام قرار پایا۔ اگرچہ حالات دونوں ہی ریاستوں کے دِگرگوں تھے، لیکن اسرائیل کی ریاست شروع ہی سے ایسے سخت بگاڑ کی راہ پر چل پڑی

QuranUrdu.com

تھی جس کی بدولت اس میں شرک و بت پرستی، ظلم وستم اور فِسق و فُجور کا زور بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ جب اسرائیل کے بادشاہ اَخی اَب (Ahab) نے صَیدا (موجودہ لُبنان) کے بادشاہ کی لڑکی اِیزبل (Jezebel) سے شادی کرلی تو یہ فساد اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اس مشرک شہزادی کے اثر میں آ کر اخی اب خود بھی مشرک ہو گیا، اس نے سامریہ میں بَعْل کا مندِر اور مَذبَح تعمیر کیا، خدائے واحد کی پرستش کے بجائے بَعْل کی پرستش رائج کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اسرائیل کے شہروں میں عَلانِیَہ بَعْل کے نام پر قربانیاں کی جانے لگیں۔

یہی زمانہ تھا جب حضرت الیاس علیہ السلام یکایک منظرِ عام پر نمودار ہوئے اور انھوں نے جِلْعاد سے آ کر اَخی اَب کو نوٹس دیا کہ تیرے گناہوں کی پاداش میں اب اسرائیل کے مُلک پر بارش کا ایک قطرہ بھی نہ برسے گا، حتّٰی کہ اَوس تک نہ پڑے گی۔ خدا کے نبی کا یہ قول حرف بحرف صحیح ثابت ہوا اور ساڑھے تین سال تک بارش بالکل بند رہی۔ آخرِ کار اَخی اَب کے ہوش کچھ ٹھکانے آئے اور اس نے حضرت الیاسؑ کو تلاش کرا کے بلوایا۔ انھوں نے بارش کے لیے دعا کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ اسرائیل کے باشندوں کو اللہ ربّ العالَمین اور بَعْل کا فرق اچھی طرح بتا دیں۔ اس غرض کے لیے انھوں نے حکم دیا کہ ایک مجمعِ عام میں بَعْل کے پجاری بھی آ کر اپنے معبُود کے نام پر قربانی کریں اور میں بھی اللہ ربّ العالَمین کے نام پر قربانی کروں گا۔ دونوں میں سے جس کی قربانی بھی انسان کے ہاتھوں سے آگ لگائے بغیر غیبی آگ سے بھسم ہو جائے اس کے معبُود کی سچّائی ثابت ہو جائے گی۔ اخی اب نے یہ بات قبول کر لی۔ چنانچہ کوہِ کَرمِل (Carmel) پر بَعْل کے ساڑھے آٹھ سو پُجاری جمع ہوئے اور اسرائیلیوں کے مجمعِ عام میں ان کا اور حضرت الیاس علیہ السلام کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے میں بَعْل پرستوں نے شکست کھائی اور حضرت الیاسؑ نے سب کے سامنے یہ ثابت کر دیا کہ بَعْل ایک جھوٹا خدا ہے، اصل خدا وہی ایک اکیلا خدا ہے جس کے نبی کی حیثیت سے وہ مامور ہو کر آئے ہیں۔ اس کے بعد حضرت الیاسؑ نے اسی مجمعِ عام میں بَعْل کے پُجاریوں کو قتل کرا دیا، اور پھر بارش کے لیے دعا کی جو فوراً قبول ہوئی، یہاں تک کہ پورا ملک اسرائیل سیراب ہو گیا۔

لیکن ان معجزات کو دیکھ کر بھی زَن مرید اَخی اَب اپنی بت پرست بیوی کے شکنجے سے نہ نکلا۔ اس کی بیوی اِیزبل حضرت الیاسؑ کی دشمن ہو گئی اور اس سے قسم کھالی کہ جس طرح بَعْل کے پُجاری قتل کیے گئے ہیں اسی طرح الیاس علیہ السلام بھی قتل کیے جائیں گے۔ اِن حالات میں حضرت الیاسؑ کو ملک چھوڑنا پڑا اور چند سال تک وہ کوہِ سینا کے دامن میں پناہ گزیں رہے۔ اس موقع پر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے جو فریاد کی تھی اسے بائبل ان الفاظ میں نقل کرتی ہے:

”بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا اور تیرے مَذبَحوں کو ڈھا دیا اور تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک مَیں ہی اکیلا بچا ہوں۔ سو وہ میری جان لینے کے دَرپے ہیں۔“ (۱-سلاطین ۱۹:۱۰)

اُسی زمانے میں بیت المَقْدِس کی یہودی ریاست کے فرماں روا یَہورام (Jehoram) نے اسرائیل کے بادشاہ اَخی اَب کی بیٹی سے شادی کر لی، اور اس مشرک شہزادی کے اثر سے وہی تمام خرابیاں جو اسرائیل میں پھیلی ہوئی تھیں، یہودیہ کی ریاست میں بھی پھیلنے لگیں۔ حضرت الیاسؑ نے یہاں بھی فریضۂ نبوت ادا کیا اور یہورام کو ایک خط لکھا جس کے یہ الفاظ بائبل میں نقل ہوئے ہیں:

”خداوند تیرے باپ داؤد کا خدا یوں فرماتا ہے: اس لیے کہ تُو نہ اپنے باپ یہُوسفط کی راہوں پر اور نہ

QuranUrdu.com

اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ

کیا تم بَعل[۷۱] کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑ دیتے ہو، اُس اللہ کو جو تمھارا اور تمھارے اگلے پچھلے

یہوداہ کے بادشاہ آسا کی راہوں پر چلا، بلکہ اسرائیل کے بادشاہوں کی راہ پر چلا ہے اور یہوداہ اور (یروشلیم) یروشلم کے باشندوں کو زنا کار بنایا جیسا اَخی اَب کے خاندان نے کیا تھا اور اپنے باپ کے گھرانے میں سے اپنے بھائیوں کو جو تجھ سے اچھے تھے، قتل بھی کیا، سو دیکھ! خداوند تیرے لوگوں کو اور تیرے بیٹوں اور تیری بیویوں کو اور تیرے سارے مال کو بڑی آفتوں سے مارے گا اور تو انتڑیوں کے مرض کے سبب سے سخت بیمار ہو جائے گا، یہاں تک کہ تیری انتڑیاں اُس مرض کے سبب سے روز بروز نکلتی جائیں گی۔'' (۲-تواریخ، ۲۱: ۱۲-۱۵)

اس خط میں حضرت الیاسؑ نے جو کچھ فرمایا تھا وہ پورا ہوا۔ پہلے یہورام کی ریاست بیرونی حملہ آوروں کی تاخت سے تباہ ہوئی اور اس کی بیویوں تک کو دشمن پکڑ لے گئے، پھر وہ خود انتڑیوں کے مرض سے ہلاک ہوا۔

چند سال کے بعد حضرت الیاسؑ پھر اسرائیل تشریف لے گئے اور انھوں نے اَخی اَب کو، اور اس کے بعد اس کے بیٹے اَخزیاہ کو راہِ راست پر لانے کی مسلسل کوشش کی، مگر جو بدی سامریہ کے شاہی خاندان میں گھر کر چکی تھی وہ کسی طرح نہ نکلی۔ آخرِ کار حضرت کی بددعا سے اَخی اَب کا گھرانا ختم ہو گیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو دنیا سے اٹھا لیا۔

ان واقعات کی تفصیل کے لیے بائبل کے حسبِ ذیل ابواب مُلاحظہ ہوں: ۱-سلاطین، باب ۱۷-۱۸-۱۹-۲۱، ۲-سلاطین، باب ۱-۲، ۲-تواریخ، باب ۲۱۔

۷۱- بَعْل کے لُغوی معنیٰ آقا، سردار اور مالک کے ہیں۔ شوہر کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا تھا اور متعدِّد مَقامات پر خود قرآنِ مجید میں استعمال ہوا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ آیت ۲۲۸، سورۂ نساء آیت ۱۲۷، سورۂ ہود آیت ۷۲، اور سورۂ نور آیت ۳۱ میں۔ لیکن قدیم زمانے کی سامی اقوام اس لفظ کو الٰہ یا خداوند کے معنیٰ میں استعمال کرتی تھیں، اور انھوں نے ایک خاص دیوتا کو بَعْل کے نام سے موسوم کر رکھا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ لبنان کی فینیقی قوم (Phoenicians) کا سب سے بڑا نر دیوتا بَعْل تھا اور اس کی بیوی عَستارات (Ashtoreth) ان کی سب سے بڑی دیوی تھی۔ محققین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا بَعْل سے مراد سورج ہے یا مُشتری، اور عَستارات سے مراد چاند ہے یا زُہرہ۔ بہرحال یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ بابِل سے لے کر مصر تک پورے مشرقِ اوسط میں بَعْل پرستی پھیلی ہوئی تھی، اور خُصوصاً لبنان اور شام و فلسطین کی مشرک اقوام بُری طرح اس میں مبتلا تھیں۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکلنے کے بعد فلسطین اور شرقِ اُردُن میں آ کر آباد ہوئے، اور تورات کے سخت امتناعی احکام کی خلاف ورزی کر کے انھوں نے اِن مشرک قوموں کے ساتھ شادی بیاہ اور معاشرت کے تعلقات قائم کرنے شروع کر دیے، تو ان کے اندر بھی یہ مرض پھیلنے لگا۔ بائبل کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفۂ اوّل حضرت یُوشَعؑ بن نُون کی وفات کے بعد ہی بنی اسرائیل میں یہ اَخلاقی و دینی زوال رونما ہونا شروع ہو گیا تھا:

''اور بنی اسرائیل نے خدا کے آگے بدی کی اور بَعلیم کی پرستش کرنے لگے..... اور وہ خداوند کو چھوڑ کر

QuranUrdu.com

اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ
الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۲۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ
يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا

آبا و اجداد کا رب ہے؟'' مگر انھوں نے اسے جھٹلا دیا، سو اب یقیناً وہ سزا کے لیے پیش کیے جانے والے ہیں، بجز اُن بندگانِ خدا کے جن کو خالص کر لیا گیا تھا۔[۷۲] اور الیاسؑ کا ذکرِ خیر ہم نے بعد کی نسلوں میں باقی رکھا۔[۷۳] سلام ہے الیاسؑ پر۔[۷۴] ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ واقعی وہ ہمارے مومن بندوں

بَعْل اور عستارات کی پرستش کرنے لگے۔'' (قُضاۃ ۲: ۱۱-۱۳)

''سو بنی اسرائیل کَنعانیوں اور حِتّیوں اور اَموریوں اور فِرِزّیوں اور حَوِّیوں اور یَبُوسیوں کے درمیان بس گئے اور اُن کی بیٹیوں سے آپ نکاح کرنے اور اپنی بیٹیاں اُن کے بیٹوں کو دینے اور اُن کے دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے۔'' (قُضاۃ، ۳: ۵-۶)

اُس زمانہ میں بَعْل پرستی اسرائیلیوں میں اس قدر گُھس چکی تھی کہ بائبل کے بیان کے مطابق ان کی ایک بستی میں عَلانِیَہ بَعْل کا مَذبَح بنا ہوا تھا جس پر قربانیاں کی جاتی تھیں۔ ایک خدا پرست اسرائیلی اس حالت کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے رات کے وقت چپکے سے یہ مَذبَح توڑ دیا۔ دوسرے روز ایک مجمعِ کثیر اکٹھا ہو گیا اور وہ اس شخص کے قتل کا مطالبہ کرنے لگا جس نے شرک کے اس اَڈّے کو توڑا تھا۔ (قُضاۃ، ۶: ۲۵-۳۲) اس صورتِ حال کو آخرِ کار حضرت سموئیل، طالوت، داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام نے ختم کیا اور نہ صرف بنی اسرائیل کی اصلاح کی بلکہ اپنی مَملکت میں بالعُموم شرک و بت پرستی کو دبا دیا۔ لیکن حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد یہ فتنہ پھر اُبھرا اور خاص طور پر شمالی فلسطین کی اسرائیلی ریاست بَعْل پرستی کے سیلاب میں بہ گئی۔

۷۲ - یعنی اس سزا سے صرف وہی لوگ مستثنیٰ ہوں گے جنھوں نے حضرت الیاسؑ کو نہ جھٹلایا اور جن کو اللہ نے اُس قوم میں سے اپنی بندگی کے لیے چھانٹ لیا۔

۷۳ - حضرت الیاس علیہ السلام کو ان کی زندگی میں تو بنی اسرائیل نے جیسا کچھ ستایا اُس کی داستان اُوپر گزر چکی ہے، مگر بعد میں وہ ان کے ایسے گرویدہ و شیفتہ ہوئے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد کم ہی لوگوں کو انھوں نے اُن سے بڑھ کر جلیل القدر ماننا ہوگا۔ اُن کے ہاں مشہور ہو گیا کہ الیاس علیہ السلام ایک بگُولے میں آسمان پر زندہ اُٹھا لیے گئے ہیں (۲-سلاطین، باب دوم)، اور یہ کہ وہ پھر دنیا میں تشریف لائیں گے۔ چنانچہ بائبل کی کتاب مَلاکی میں لکھا ہے:

''دیکھو، خداوند کے بزرگ اور ہولناک دن کے آنے سے پیشتر میں اِیلیّاہ نبی کو تمھارے پاس بھیجوں گا۔'' (۴: ۵)

حضرت یحییٰؑ اور عیسیٰؑ کی بِعثَت کے زمانے میں یہودی بالعُموم تین آنے والوں کے منتظر تھے: ایک، حضرت الیاسؑ۔

QuranUrdu.com

الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ
اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَ
اِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَبِالَّيْلِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ ع ۴ ۲۵ ۸

میں سے تھا۔

اور لوطؑ بھی اُنھی لوگوں میں سے تھا جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یاد کرو جب ہم نے اس کو اور اس کے سب گھر والوں کو نجات دی، سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی[۷۵]۔ پھر باقی سب کو تہس نہس کر دیا۔ آج تم شب و روز اُن کے اُجڑے دِیار پر سے گزرتے ہو[۷۶]۔ کیا تم کو عقل نہیں آتی؟ ع

دوسرے، مسیحؑ۔ تیسرے، ''وہ نبی'' (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم)۔ جب حضرت یحییٰؑ کی نبوت شروع ہوئی اور انھوں نے لوگوں کو اِصطباغ دینا شروع کیا تو یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں نے ان کے پاس جا کر پوچھا: کیا تم مسیح ہو؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ پھر پوچھا: کیا تم اِیلیّاہ ہو؟ انھوں نے کہا: نہیں۔ پھر پوچھا: کیا تم ''وہ نبی'' ہو؟ انھوں نے کہا: میں وہ بھی نہیں ہوں۔ تب انھوں نے کہا: اگر تم نہ مسیح ہو، نہ اِیلیّاہ ہو، نہ وہ نبی، تو پھر تم بپتسمہ کیوں دیتے ہو؟ (یُوحنّا، ۱:۱۹-۲۶) پھر کچھ مدت بعد جب حضرت عیسٰی علیہ السلام کا غُلغُلَہ بلند ہوا تو یہودیوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ شاید اِیلیّاہ نبی آ گئے ہیں۔ (مَرقُس ۶: ۱۴-۱۵) خود حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حَواریوں میں بھی یہ خیال پھیلا ہوا تھا کہ اِیلیّاہ نبی آنے والے ہیں۔ مگر حضرت نے یہ فرما کر ان کی غلط فہمی کو رفع فرمایا کہ ''اِیلیّاہ تو آ چکا، اور لوگوں نے اسے نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا۔'' اس سے حَواری خود جان گئے کہ دراصل آنے والے حضرت یحییٰؑ تھے نہ کہ آٹھ سو برس پہلے گزرے ہوئے حضرت الیاسؑ۔ (مَتّی، ۱۱: ۱۴ اور مَتّی، ۱۷: ۱۰-۱۳)

۷۴ - اصل میں الفاظ ہیں: سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ۔ اس کے متعلق بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ حضرت الیاسؑ کا دوسرا نام ہے، جس طرح حضرت ابراہیمؑ کا دوسرا نام ابراہام تھا۔ اور بعض دوسرے مفسرین کا قول ہے کہ اہلِ عرب میں عِبرانی اَسما کے مختلف تلفُّظ رائج تھے، مثلاً میکال اور میکائیل اور میکائین ایک ہی فرشتے کو کہا جاتا تھا۔ ایسا ہی معاملہ حضرت الیاسؑ کے نام کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ خود قرآنِ مجید میں ایک ہی پہاڑ کا نام طُورِ سینا بھی آیا ہے اور طُورِ سینین بھی۔

۷۵ - اس سے مراد حضرت لوطؑ کی بیوی ہے جو ہجرت کا حکم آنے پر اپنے شوہرِ نامدار کے ساتھ نہ گئی بلکہ اپنی قوم کے ساتھ رہی اور مبتلائے عذاب ہوئی۔

۷۶ - اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ قریش کے تاجر شام و فلسطین کی طرف جاتے ہوئے شب و روز اس علاقے سے گزرتے تھے جہاں قومِ لوطؑ کی تباہ شدہ بستیاں واقع تھیں۔

QuranUrdu.com

وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾
فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوْ
لَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

النصف النصف

اور یقیناً یُونُسؑ بھی رسولوں میں سے تھا۔[۷۷] یاد کرو جب وہ ایک بھری کشتی کی طرف بھاگ نکلا،[۷۸] پھر قرعہ اندازی میں شریک ہوا اور اس میں مات کھائی۔[۷۹] آخرِکار مچھلی نے اسے نگل لیا اور وہ ملامت زدہ تھا۔[۸۰] اب اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا[۸۱] تو روزِ قیامت تک اسی مچھلی کے پیٹ میں رہتا۔

---

۷۷ - یہ تیسرا موقع ہے جہاں حضرت یُونُس علیہ السلام کا ذکر قرآنِ مجید میں آیا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ یُونُس اور سورۂ انبیا میں ان کا ذکر گزر چکا ہے اور ہم اس کی تشریح کر چکے ہیں۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، یُونُس، حواشی ۹۸ تا ۱۰۰۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۸۲ تا ۸۵)

۷۸ - اصل میں لفظ اَبَقَ استعمال ہوا ہے، جو عَرَبی زبان میں صرف اُس وقت بولا جاتا ہے جب کہ غلام اپنے آقا کے ہاں سے بھاگ جائے۔ الاباق ھرب العبد من سیّدہٖ ''اِباق کے معنٰی ہیں غلام کا اپنے آقا سے فرار ہو جانا۔'' (لِسان العرب)

۷۹ - ان فقروں پر غور کرنے سے جو صورتِ واقعہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ:

(۱) حضرت یُونُسؑ جس کشتی میں سوار ہوئے تھے وہ اپنی گنجایش سے زیادہ بھری ہوئی (overloaded) تھی۔

(۲) قرعہ اندازی کشتی میں ہوئی، اور غالباً اس وقت ہوئی جب بحری سفر کے دوران میں یہ محسوس ہوا کہ بوجھ کی زیادتی کے سبب سے تمام مسافروں کی جان خطرے میں پڑ گئی ہے۔ لہٰذا قرعہ اس غرض کے لیے ڈالا گیا کہ جس کا نام قرعے میں نکلے، اسے پانی میں پھینک دیا جائے۔

(۳) قرعے میں حضرت یُونُسؑ ہی کا نام نکلا، وہ سمندر میں پھینک دیے گئے اور ایک مچھلی نے ان کو نگل لیا۔

(۴) اِس ابتلا میں حضرت یونسؑ اس لیے مبتلا ہوئے کہ وہ اپنے آقا (یعنی اللہ تعالیٰ) کی اجازت کے بغیر اپنے مَقامِ ماموریت سے فرار ہو گئے تھے۔ اس معنٰی پر لفظ اَبَقَ بھی دلالت کرتا ہے جس کی تشریح اُوپر حاشیہ نمبر ۷۸ میں گزر چکی ہے، اور اسی معنٰی پر لفظ مُلِیْم بھی دلالت کرتا ہے۔ مُلِیْم ایسے قصوروار آدمی کو کہتے ہیں جو اپنے قصور کی وجہ سے آپ ہی ملامت کا مستحق ہو گیا ہو، خواہ اسے ملامت کی جائے یا نہ کی جائے۔ (یقال قد الام الرجل اذا اتٰی ما یلام علیہ من الامر وان لم یُلَم۔ ابنِ جَرِیر)

۸۰ - اس کے دو مطلب ہیں اور دونوں ہی مراد ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام پہلے ہی

QuranUrdu.com

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿۱۴۶﴾

آخرکار ہم نے اسے بڑی سقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینک دیا۔[۸۲] اور اُس پر ایک بیل دار درخت اُگا دیا۔[۸۳]

خدا سے غافل لوگوں میں سے نہ تھے، بلکہ اُن لوگوں میں سے تھے جو دائماً اللہ کی تسبیح کرنے والے ہیں۔ دوسرے، یہ کہ جب وہ مچھلی کے پیٹ میں پہنچے تو انھوں نے اللہ ہی کی طرف رُجوع کیا اور اس کی تسبیح کی۔ سورۂ انبیا میں ارشاد ہوا ہے: فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ پس اُن تاریکیوں میں اُس نے پکارا: ''نہیں ہے کوئی خدا مگر تُو، پاک ہے تیری ذات، بے شک میں قصوروار ہوں۔''

۸۱ - اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مچھلی قیامت تک زندہ رہتی اور حضرت یُونُسؑ قیامت تک اس کے پیٹ میں زندہ رہتے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت تک اس مچھلی کا پیٹ ہی حضرت یونسؑ کی قبر بنا رہتا۔ مشہور مفسر قَتَادَہؒ نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ (ابنِ جَرِیر)

۸۲ - یعنی جب حضرت یونسؑ نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا اور وہ ایک بندۂ مومن و قانت کی طرح اس کی تسبیح میں لگ گئے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے مچھلی نے اُن کو ساحل پر اُگل دیا۔ ساحل ایک چٹیل میدان تھا جس میں کوئی روئیدگی نہ تھی، نہ کوئی ایسی چیز تھی جو حضرت یونسؑ پر سایہ کرتی، نہ وہاں غذا کا کوئی سامان موجود تھا۔

اِس مَقام پر بہت سے عقلیّت کے مدّعی حضرات یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ مچھلی کے پیٹ میں جا کر کسی انسان کا زندہ نکل آنا غیر ممکن ہے۔ لیکن پچھلی ہی صدی کے اواخر میں اِس نام نہاد عقلیّت کے گڑھ (انگلستان) کے سواحل سے قریب ایک واقعہ پیش آ چکا ہے جو ان کے دعوے کی تردید کر دیتا ہے۔ اگست ۱۸۹۱ء میں ایک جہاز (Star of the East) پر کچھ مچھیرے وہیل کے شکار کے لیے گہرے سمندر میں گئے۔ وہاں انھوں نے ایک بہت بڑی مچھلی کو، جو ۲۰ فٹ لمبی، ۵ فٹ چَوڑی اور سوٹن وزنی تھی، سخت زخمی کر دیا۔ مگر اس سے جنگ کرتے ہوئے جیمز بارٹلے نامی ایک مچھیرے کو اُس کے ساتھیوں کی آنکھوں کے سامنے مچھلی نے نگل لیا۔ دوسرے روز وہی مچھلی اس جہاز کے لوگوں کو مری ہوئی مل گئی۔ انھوں نے بمشکل اسے جہاز پر چڑھایا اور پھر طویل جِدّوجُہد کے بعد جب اس کا پیٹ چاک کیا تو بارٹلے اس کے اندر سے زندہ برآمد ہو گیا۔ یہ شخص مچھلی کے پیٹ میں پورے ۶۰ گھنٹے رہا تھا۔ (اُردو ڈائجسٹ، فروری ۱۹۶۴ء) غور کرنے کی بات ہے کہ اگر معمولی حالات میں فطری طور پر ایسا ہونا ممکن ہے تو غیر معمولی حالات میں اللہ تعالیٰ کے معجزے کے طور پر ایسا ہونا کیوں غیر ممکن ہے؟

۸۳ - اصل الفاظ ہیں: شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ۔ یقطین عَرَبی زبان میں ایسے درخت کو کہتے ہیں جو کسی تنے پر کھڑا نہیں ہوتا بلکہ بیل کی شکل میں پھیلتا ہے، جیسے کَدُّو، تربوز، ککڑی وغیرہ۔ بہرحال وہاں کوئی ایسی بیل معجزانہ طریقے پر پیدا کر دی گئی تھی جس کے پتّے حضرت یُونُسؑ پر سایہ بھی کریں اور جس کے پھل ان کے لیے بیک وقت غذا کا کام بھی دیں اور پانی کا کام بھی۔

QuranUrdu.com

وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۴۸﴾

اس کے بعد ہم نے اُسے ایک لاکھ، یا اس سے زائد لوگوں کی طرف بھیجا،[۸۴] وہ ایمان لائے اور ہم نے ایک وقتِ خاص تک انھیں باقی رکھا۔[۸۵]

۸۴ - ''ایک لاکھ یا اس سے زائد'' کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی تعداد میں شک تھا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ان کی بستی کو دیکھتا تو یہی اندازہ کرتا کہ اس شہر کی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہی ہوگی، کم نہ ہوگی۔ اغلب یہ ہے کہ یہ وہی بستی تھی جس کو چھوڑ کر حضرت یونُسؑ بھاگے تھے۔ اُن کے جانے کے بعد عذاب آتا دیکھ کر جو ایمان اُس بستی کے لوگ لے آئے تھے اس کی حیثیت صرف توبہ کی تھی جسے قبول کر کے عذاب اُن پر سے ٹال دیا گیا تھا۔ اب حضرت یونس علیہ السلام دوبارہ ان کی طرف بھیجے گئے تاکہ وہ نبی پر ایمان لاکر باقاعدہ مسلمان ہو جائیں۔ اس مضمون کو سمجھنے کے لیے سورۂ یونس، آیت ۹۸ نگاہ میں رہنی چاہیے۔

۸۵ - حضرت یونسؑ کے اس قصے کے متعلق سورۂ یونس اور سورۂ انبیاء کی تفسیر میں جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس پر بعض لوگوں نے اعتراضات کیے ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دوسرے مفسرین کے اقوال بھی نقل کر دیے جائیں۔

مشہور مفسر قَتَادَہؒ سورۂ یونس، آیت ۹۸ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''کوئی بستی ایسی نہیں گزری ہے جو کفر کر چکی ہو اور عذاب آجانے کے بعد ایمان لائی ہو اور پھر اسے چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس سے صرف قومِ یونسؑ مستثنیٰ ہے۔ انھوں نے جب اپنے نبی کو تلاش کیا اور نہ پایا، اور محسوس کیا کہ عذاب قریب آ گیا ہے تو اللہ نے ان کے دلوں میں توبہ ڈال دی۔'' (ابنِ کثیر، جلد ۲، ص ۴۳۳)

اسی آیت کی تفسیر میں علامہ آلُوسیؒ لکھتے ہیں: ''اس قوم کا قصہ یہ ہے کہ یونُس علیہ السلام مَوصِل کے علاقے میں نِینویٰ کے لوگوں کی طرف بھیجے گئے تھے۔ یہ کافر و مشرک لوگ تھے۔ حضرت یونسؑ نے ان کو اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان لانے اور بتوں کی پرستش چھوڑ دینے کی دعوت دی۔ انھوں نے انکار کیا اور جھٹلایا۔ حضرت یونسؑ نے ان کو خبر دی کہ تیسرے دن ان پر عذاب آجائے گا، اور تیسرا دن آنے سے پہلے آدھی رات کو وہ بستی سے نکل گئے۔ پھر دن کے وقت جب عذاب اس قوم کے سروں پر پہنچ گیا..... اور انھیں یقین ہو گیا کہ سب ہلاک ہو جائیں گے تو انھوں نے اپنے نبی کو تلاش کیا، مگر نہ پایا۔ آخرِ کار وہ سب اپنے بال بچوں اور جانوروں کو لے کر صحرا میں نکل آئے اور ایمان و توبہ کا اظہار کیا..... پس اللہ نے ان پر رحم کیا اور ان کی دعا قبول کر لی۔'' (رُوح المعانی، جلد ۱۱، ص ۱۷۰)

سورۂ انبیاء کی آیت ۸۷ کی تشریح کرتے ہوئے علامہ آلُوسیؒ لکھتے ہیں: ''حضرت یونُسؑ کا اپنی قوم سے ناراض ہو کر نکل جانا ہجرت کا فعل تھا، مگر انھیں اس کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔'' (رُوح المعانی، جلد ۱۷، ص ۷۷) پھر وہ حضرت یونسؑ کی دُعا کے فقرہ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں: ''یعنی میں قصوروار تھا کہ انبیا کے طریقے کے

QuranUrdu.com

خلاف، حکم آنے سے پہلے، ہجرت کرنے میں جلدی کر بیٹھا۔ یہ حضرت یونُس علیہ السلام کی طرف سے اپنے گناہ کا اعتراف اور توبہ کا اظہار تھا تا کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس مصیبت کو دُور فرما دے۔'' (رُوح المعانی، جلد ۱۷، ص ۷۸)

مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا حاشیہ اس آیت پر یہ ہے کہ ''وہ اپنی قوم پر، جب کہ وہ ایمان نہ لائی خفا ہو کر چل دیے اور قوم پر سے عذاب ٹل جانے کے بعد بھی خود واپس نہ آئے اور اس سفر کے لیے ہمارے حکم کا انتظار نہ کیا۔'' (بیان القرآن)

اسی آیت پر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حاشیے میں فرماتے ہیں: ''قوم کی حرکات سے خفا ہو کر غصے میں بھرے ہوئے شہر سے نکل گئے، حکمِ الٰہی کا انتظار نہ کیا اور وعدہ کر گئے کہ تین دن کے بعد تم پر عذاب آئے گا..... اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ، اپنی خطا کا اعتراف کیا کہ بے شک میں نے جلدی کی کہ تیرے حکم کا انتظار کیے بدون بستی والوں کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔''

سورۂ صافّات کی آیاتِ بالا کی تشریح میں امام رازیؒ لکھتے ہیں: ''حضرت یونسؑ کا قصور یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی اس قوم کو جس نے انھیں جھٹلایا تھا، ہلاک کرنے کا وعدہ فرمایا، یہ سمجھے کہ یہ عذاب لامحالہ نازل ہونے والا ہے، اس لیے انھوں نے صبر نہ کیا اور قوم کو دعوت دینے کا کام چھوڑ کر نکل گئے، حالانکہ ان پر واجب تھا کہ دعوت کا کام برابر جاری رکھتے، کیونکہ اس امر کا امکان باقی تھا کہ اللہ ان لوگوں کو ہلاک نہ کرے۔'' (تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۱۵۸)

علّامہ آلُوسیؒ اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ پر لکھتے ہیں: ''اَبَق کے اصل معنٰی آقا کے ہاں سے غلام کے فرار ہونے کے ہیں۔ چونکہ حضرت یونسؑ اپنے رب کے اِذن کے بغیر اپنی قوم سے بھاگ نکلے تھے، اس لیے اس لفظ کا اِطلاق ان پر دُرست ہوا۔'' پھر آگے چل کر لکھتے ہیں: ''جب تیسرا دن ہوا تو حضرت یونسؑ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نکل گئے۔ اب جو ان کی قوم نے ان کو نہ پایا تو وہ اپنے بڑے اور چھوٹے اور جانوروں، سب کو لے کر نکلے، اور نُزولِ عذاب ان سے قریب تھا، پس انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور زاری کی اور معافی مانگی اور اللہ نے انھیں معاف کر دیا۔'' (روح المعانی، جلد ۲۳، ص ۱۳۰)

مولانا شبیر احمد صاحبؒ وَهُوَ مُلِيْمٌ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''الزام یہی تھا کہ خطائے اجتہادی سے حکمِ الٰہی کا انتظار کیے بغیر بستی سے نکل پڑے اور عذاب کے دن کی تعیین کر دی۔''

پھر سورۂ القلم کی آیت فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ پر مولانا شبیر احمد صاحبؒ کا حاشیہ یہ ہے: ''یعنی مچھلی کے پیٹ میں جانے والے پیغمبر (حضرت یونس علیہ السلام) کی طرح مکذّبین کے معاملے میں تنگ دلی اور گھبراہٹ کا اظہار نہ کیجیے۔'' اور اسی آیت کے فقرہ وَهُوَ مَكْظُوْمٌ پر حاشیہ تحریر کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں: ''یعنی قوم کی طرف سے غصے میں بھرے ہوئے تھے۔ جھنجلا کر شتابیِ عذاب کی دُعا، بلکہ پیشین گوئی کر بیٹھے۔''

مفسرین کے ان بیانات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تین قصور تھے جن کی وجہ سے حضرت یونُسؑ پر عتاب ہوا: ایک، یہ کہ انھوں نے عذاب کے دن کی خود ہی تعیین کر دی حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا کوئی اعلان نہ ہوا تھا۔ دوسرے، یہ کہ وہ دن آنے سے پہلے ہجرت کر کے ملک سے نکل گئے، حالانکہ نبی کو اس وقت تک اپنی جگہ نہ چھوڑنی چاہیے جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہ آجائے۔

QuranUrdu.com

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ
اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾
وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿۱۵۳﴾
مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَمْ لَكُمْ
سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۷﴾

پھر ذرا اِن لوگوں سے پوچھو:[۸۶] کیا (اِن کے دل کو یہ بات لگتی ہے کہ) تمھارے رب کے لیے تو ہوں بیٹیاں اور اِن کے لیے ہوں بیٹے![۸۷] کیا واقعی ہم نے ملائکہ کو عورتیں ہی بنایا ہے اور یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں؟ خوب سُن رکھو! دراصل یہ لوگ اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے، اور فی الواقع یہ جھوٹے ہیں۔ کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لیے پسند کر لیں؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے، کیسے حکم لگا رہے ہو۔ کیا تمھیں ہوش نہیں آتا۔ یا پھر تمھارے پاس اپنی اِن باتوں کے لیے کوئی صاف سند ہے، تو لاؤ اپنی وہ کتاب، اگر تم سچّے ہو۔[۸۸]

تیسرے، یہ کہ جب اس قوم پر سے عذاب ٹل گیا تو واپس نہ گئے۔

۸۶ - یہاں سے ایک دوسرا مضمون شروع ہوتا ہے۔ پہلا مضمون آیت نمبر ۱۱ سے شروع ہوا تھا جس میں کفارِ مکہ کے سامنے یہ سوال رکھا گیا تھا: ''ان سے پوچھو، کیا ان کا پیدا کرنا زیادہ مشکل کام ہے یا اُن چیزوں کا جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں۔'' اب انھی کے سامنے یہ دوسرا سوال پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلے سوال کا منشا کفار کو اُن کی اِس گمراہی پر مُتَنَبِّہ کرنا تھا کہ وہ زندگی بعدِ موت اور جزا و سزا کو غیر ممکن الوقوع سمجھتے تھے اور اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اُڑاتے تھے۔ اب یہ دوسرا سوال اُن کی اِس جہالت پر مُتَنَبِّہ کرنے کے لیے پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد منسوب کرتے تھے اور قیاسی گھوڑے دوڑا کر جس کا چاہتے تھے، اللہ سے رشتہ جوڑ دیتے تھے۔

۸۷ - رِوایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں قریش، جُہَینَہ، بنی سَلِمَہ، خُزاعہ، بنی مُلَیح اور بعض دوسرے قبائل کا عقیدہ یہ تھا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ قرآنِ مجید میں متعدِّد مقامات پر ان کے اس جاہلانہ عقیدے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: النساء، آیت ۱۱۷۔ النحل آیات، ۵۷-۵۸۔ بنی اسرائیل، آیت ۴۰۔ الزخرف، آیات ۱۶ تا ۱۹۔ النجم، آیات ۲۱ تا ۲۷۔

۸۸ - یعنی ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دینے کے لیے دو ہی بنیادیں ہو سکتی ہیں: یا تو ایسی بات مشاہدے کی

QuranUrdu.com

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ
لَمُحْضَرُوْنَ ۙ﴿۱۵۸﴾ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ
الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ۙ﴿۱۶۱﴾ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ
بِفٰتِنِيْنَ ۙ﴿۱۶۲﴾ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ
مَّعْلُوْمٌ ۙ﴿۱۶۴﴾ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۚ﴿۱۶۵﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

اِنھوں نے اللہ اور ملائکہ[۸۹] کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے، حالانکہ ملائکہ خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ مُجرم کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں (اور وہ کہتے ہیں کہ) ''اللہ اُن صفات سے پاک ہے جو اُس کے خالص بندوں کے سوا دوسرے لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ پس تم اور تمھارے یہ معبُود، اللہ سے کسی کو پھیر نہیں سکتے مگر صرف اُس کو جو دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جُھلسنے والا ہو[۹۰]۔ اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر اَیک کا ایک مَقام مقرر ہے[۹۱]، اور ہم صف بستہ خدمت گار ہیں اور تسبیح کرنے والے ہیں۔''

بنا پر کہی جاسکتی ہے، یا پھر اس طرح کا دعویٰ کرنے والے کے پاس کوئی کتابِ الٰہی ہونی چاہیے جس میں اللہ تعالیٰ نے خود یہ فرمایا ہو کہ ملائکہ میری بیٹیاں ہیں۔ اب اگر اس عقیدے کے قائلین نہ مشاہدے کا دعویٰ کر سکتے ہیں، اور نہ کوئی کتابِ الٰہی ایسی رکھتے ہیں جس میں یہ بات کہی گئی ہو، تو اس سے بڑی جَہالت وحماقت اور کیا ہوسکتی ہے کہ محض ہوائی باتوں پر ایک دینی عقیدہ قائم کرلیا جائے اور خداوندِ عالَم کی طرف ایسی باتیں منسوب کی جائیں جو صریحاً مضحکہ انگیز ہیں۔

۸۹ - اصل میں ملائکہ کے بجائے الجِنّہ کا لفظ استعمال ہوا ہے، لیکن بعض اکابر مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں جِنّ کا لفظ اپنے لغوی مفہُوم (پوشیدہ مخلوق) کے لحاظ سے ملائکہ کے لیے استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ ملائکہ بھی اصلاً ایک پوشیدہ مخلوق ہی ہیں۔ اور بعد کا مضمون اسی بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہاں الجِنّۃ کے لفظ کو ملائکہ کے معنیٰ میں لیا جائے۔

۹۰ - اس آیت کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے: ''پس تم اور تمھاری یہ عبادت، اس پر تم کسی کو فتنے میں نہیں ڈال سکتے مگر صرف اُس کو جو.....'' اس دوسرے ترجمے کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ اے گمراہو! یہ جو تم ہماری پرستش کر رہے ہو اور ہمیں اللہ ربّ العالمین کی اولاد قرار دے رہے ہو، اس سے تم ہم کو فتنے میں نہیں ڈال سکتے۔ اس سے تو کوئی ایسا احمق ہی فتنے میں پڑ سکتا ہے جس کی شامت سر پر سوار ہو۔ دوسرے الفاظ میں گویا فرشتے اپنے ان پرستاروں سے کہہ رہے

QuranUrdu.com

وَإِنْ كَانُوا لَيَقُولُونَ ﴿١٦٧﴾ لَوْ أَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِنَ الْأَوَّلِينَ ﴿١٦٨﴾ لَكُنَّا
عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿١٦٩﴾ فَكَفَرُوا بِهِ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿١٧٠﴾ وَلَقَدْ
سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ﴿١٧١﴾ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ ﴿١٧٢﴾
وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ ﴿١٧٣﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّى حِينٍ ﴿١٧٤﴾
وَأَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ ﴿١٧٥﴾ أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿١٧٦﴾

یہ لوگ پہلے تو کہا کرتے تھے کہ کاش! ہمارے پاس وہ ''ذِکر'' ہوتا جو پچھلی قوموں کو ملا تھا تو ہم اللہ کے چیدہ بندے ہوتے[92]۔ مگر (جب وہ آ گیا) تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا۔ اب عنقریب اِنھیں (اِس رَوِش کا نتیجہ) معلوم ہو جائے گا۔ اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے[93] گا۔ پس اے نبیؐ! ذرا کچھ مدّت تک اِنھیں اِن کے حال پر چھوڑ دو اور دیکھتے رہو، عنقریب یہ خود بھی دیکھ لیں[94] گے۔ کیا یہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟

ہیں کہ ''برد ایں دام بر مرغِ دِگر نِہ۔''

۹۱ – یعنی اللہ کی اولاد ہونا تو درکنار، ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے جس کا جو درجہ اور مرتبہ مقرر ہے اس سے ذرّہ برابر تجاوُز تک کرنے کی مجال ہم نہیں رکھتے۔

۹۲ – یہی مضمون سورۂ فاطر، آیت ۴۲ میں گزر چکا ہے۔

۹۳ – اللہ کے لشکر سے مراد وہ اہلِ ایمان ہیں جو اللہ کے رسول کی پیروی کریں اور اس کا ساتھ دیں۔ نیز وہ غیبی طاقتیں بھی اس میں شامل ہیں جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اہلِ حق کی مدد فرماتا ہے۔

اس امداد اور غلبہ کے معنٰی لازماً یہی نہیں ہیں کہ ہر زمانے میں اللہ کے ہر نبی اور اس کے پیروؤں کو سیاسی غلبہ ہی حاصل ہو، بلکہ اس غلبے کی بہت سی صورتیں ہیں جن میں سے ایک سیاسی غلبہ بھی ہے۔ جہاں اِس نوعیت کا اِستیلا اللہ کے نبیوں کو حاصل نہیں ہوا ہے، وہاں بھی ان کا اَخلاقی تَفَوُّق ثابت ہو کر رہا ہے۔ جن قوموں نے ان کی بات نہیں مانی ہے اور ان کی دی ہوئی ہدایات کے خلاف راستہ اختیار کیا ہے وہ آخرِ کار برباد ہو کر رہی ہیں۔ جَہالت وضلالت کے جو فلسفے بھی لوگوں نے گھڑے اور زندگی کے جو بگڑے ہوئے اطوار بھی زبردستی رائج کیے گئے وہ سب کچھ مدّت تک زور دکھانے کے بعد آخرِ کار اپنی موت آپ مر گئے۔ مگر جن حقیقتوں کو ہزارہا برس سے اللہ کے نبی حقیقت وصداقت کی حیثیت سے پیش کرتے رہے ہیں، وہ پہلے بھی اٹل تھیں

QuranUrdu.com

فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِیْنَ ﴿۱۷۷﴾ وَتَوَلَّ
عَنْهُمْ حَتّٰی حِیْنٍ ﴿۱۷۸﴾ وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ یُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ سُبْحٰنَ
رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَسَلٰمٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۸۱﴾
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۸۲﴾

ع ۵

جب وہ اِن کے صَحن میں آ اُترے گا تو وہ دن اُن لوگوں کے لیے بہت بُرا ہوگا جنھیں مُتنبّہ کیا جا چکا ہے۔ بس ذرا اِنھیں کچھ مدّت کے لیے چھوڑ دو اور دیکھتے رہو، عنقریب یہ خود دیکھ لیں گے۔

پاک ہے تیرا رب، عزّت کا مالک، اُن تمام باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔ اور سلام ہے مرسلین پر، اور ساری تعریف اللہ ربّ العالمین ہی کے لیے ہے۔ ع

اور آج بھی اٹل ہیں۔ انھیں اپنی جگہ سے کوئی ہلا نہیں سکا ہے۔

۹۴ – یعنی کچھ زیادہ مدّت نہ گزرے گی کہ اپنی شکست اور تمھاری فتح کو یہ لوگ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ یہ بات جس طرح فرمائی گئی تھی اُسی طرح پوری ہوئی۔ اِن آیات کے نزول پر بمشکل ۱۴-۱۵ سال گزرے تھے کہ کفارِ مکہ نے اپنی آنکھوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فاتحانہ داخلہ اپنے شہر میں دیکھ لیا، اور پھر اس کے چند سال بعد انھی لوگوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اسلام نہ صرف عرب پر، بلکہ روم و ایران کی عظیم سلطنتوں پر بھی غالب آ گیا۔